وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

(1123)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

709, 7TH FLOOR, QAMAR HOUSE,
M.A. JINNAH ROAD, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880731

Ahmed Afzal
192-G, BLOCK 2
P.E.C.H.S., KARACHI
Phone: 440803

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۳ شمارہ ۱ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق جنوری ۱۹۸۴ء

مشمولات

عرض احوال ——— ۳
اقتدار احمد
الہدیٰ ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد
اسلام کا جماعتی نظام ——— ۱۹
مولانا الطاف الرحمن بنوی
شرک اور اقسام شرک (قسط سوم) ۳۳
ڈاکٹر اسرار احمد
قند مکرر ———
مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت علمائے ہند اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ۴۹
ڈاکٹر اسرار احمد
مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت ۷۱
(ادارہ)
قرآن کا عجیب ہونا — (آخری قسط) ۷۳
محمد اقبال ولھو
رفتار کار ——— ۸۱
ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو ——— ۹۷
(بشکریہ ماہنامہ آنچل کراچی)

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زر تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

قارئین متوجّہ ہوں!

- ادارہ میثاق نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنوری ۱۹۸۴ء سے میثاق کے صفحات کی تعداد میں سولہ صفحات کا اضافہ کر دیا جائے یعنی اب سے میثاق کے کم سے کم چھیانوے صفحات ہوا کریں گے۔ مگر قیمت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا۔
- ادارہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ آئندہ سے زرِ تعاون صرف منی آرڈر یا کیش کی شکل میں وصول کیا جائے گا۔ لیکن جو خریدار حضرات چیک روانہ کرنا چاہیں وہ چالیس روپے کا چیک روانہ فرمائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چیک کیش کروانے میں دس یا بارہ روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ جو بلا شبہ ادارے پر اضافی بوجھ ہے۔ توقع ہے کہ قارئین اسے اپنے لئے بار متصوّر نہیں کریں گے۔ بیرونی ممالک سے ڈرافٹ حسبِ سابق قابلِ قبول ہوں گے۔
- ماہنامہ میثاق کا سالانہ زرِتعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِتعاون حسبِ ذیل ہے:

  کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

  امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

  انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے

  سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے

  انڈیا -/۸۰ روپے
- پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

★ پشاور : دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور

★ ملتان : عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال، ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ : دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد بلوچی مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون ۷۷۲۹۵

★ کراچی : داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۴۷۰۹

5/16/36

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

الحمدللہ کہ زیرِ نظر شمارے کے ذریعے میثاق کی تینتیسویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ امر یقیناً باعثِ مسرت ہوگا کہ اس موقع پر ہم نے میثاق کے صفحات بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پچھلے ماہ تک صورتِ حال یہ تھی کہ عموماً میثاق ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاہم بعض اوقات صفحات کی تعداد اس سے متجاوز ہو جاتی تھی۔ آئندہ کے لئے طے پایا ہے کہ ان شاء اللہ صفحات کی تعداد ۹۶ سے کم تو نہ ہو گی البتہ فوری اور وقتی ضرورت کے پیشِ نظر اس میں اضافے کا امکان موجود رہے گا۔ زیرِ نظر شمارہ جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ہمارے لئے "علیٰ ما نقول وکیل" کا کردار ادا کر رہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ امر مزید باعثِ اطمینان ہوگا کہ زرِ تعاون حسبِ سابق رہے گا اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

اس شمارے میں "اسلام کا جماعتی نظام" کے عنوان سے مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی کا ایک گراں قدر اور فکر انگیز مضمون شامل ہے۔ مولانا موصوف نے یہ مضمون محاضراتِ قرآنی منعقدہ اکتوبر [۸۲ء] میں بصورتِ مقالہ پیش فرمایا تھا ——— حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں ہم "اسلام کا جماعتی نظام اور نظمِ جماعت کی اہمیت" جیسے اہم مسئلوں پر بحیثیت مجموعی کچھ سوچنے کی ضرورت کے احساس سے بھی بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف دینی اضمحلال اور اسلام کی بحیثیت دین مغلوبیت کو ایک تلخ حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے بلکہ اب ہم اس حقیقت سے ایسے صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ ع کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا! اور بحیثیت ملت حقائق سے چشم پوشی کے مآل سے پوری امت دوچار ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　　نہیں کرتی مگر ملت کے گناہوں کو معاف

ہم یہ بات بھول چکے ہیں کہ اسلام 'دین' ہے محض مذہب نہیں۔ اور بحیثیتِ امتِ محمدیہ جہاں ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اس پیغامِ رسالت کو ہر فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں وہیں یہ اہم فریضہ بھی ہم پر عائد

ہوتا ہے کہ ہم اس دین کو غالب و نافذ کریں۔ ہم سورۂ مائدہ کی اس عظیم آیت کو بیان کرنے میں تو بہت فخر محسوس کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لئے میں نے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا" لیکن دین کی اقامت اور سربلندی کے ذیل میں ذمہ داری کا کسی درجے میں بھی احساس ہمیں حاصل نہیں۔ حالانکہ اللہ نے ہم پر یہ احسانِ عظیم فرمایا ہی اس لئے تھا کہ دین کو قائم اور نافذ کیا جائے (اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ)۔ مسلمان اگر کسی ایسے خطے میں آباد ہوں جہاں اللہ کا دین مغلوب ہو اور اس کی شریعت غالب و نافذ نہ ہو تو بحیثیتِ مسلمان ان کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ غلط نظام کو بدلنے کی کوشش کریں اور اقامتِ دین کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔
اگر دین فی الواقع نام ہے سُنّتِ محمدیؐ اور سنّتِ خلفائے راشدینؓ کا تو پھر اس معاملے میں دو رائیں ممکن نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زندگیوں کا تو مشن ہی یہ تھا کہ اللہ کے پیغام کو پھیلائیں اور اس کے دین کو غالب و نافذ کریں۔ ان کے سامنے بطورِ ہدف یہ آیت مبارکہ تھی کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ مقامِ غور ہے کہ اگر اقامتِ دین اور اس کے لئے نظمِ جماعت امّت کا فرضِ منصبی نہیں ہے تو دورِ خلافتِ راشدہ میں صحابہ کرامؓ نے غلبۂ دین کے لئے جان و مال کی جو قربانیاں دیں اور جہاد و قتال کا جو ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، ان سب کے لئے کوئی جواز موجود نہیں! حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ؎ بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ دین تو وہی ہے جو حضورؐ اور اور صحابہؓ کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ دین کو فی الحقیقت سمجھا ہی انہوں نے تھا۔ تبھی انہیں تاقیامِ قیامت امّت کے لئے حجّت کا درجہ حاصل ہے۔

اسلام کا جماعتی نظام کے موضوع پر یہ اہم مقالہ یقیناً فکر کی ان کہنہ راہوں کو اَز سرِ نَو کھولنے کا باعث ہو گا جن پر امتدادِ زمانہ اور غیروں کی غلامی کے اثرات نے گرد کی دبیز تہیں جما دی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تہیں اس قدر دبیز اور گہری ہیں کہ اب یہ تمام باتیں ہمیں اجنبی اور نامانوس دکھائی دیتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ!

دسویں ۱۰ نشست

الھدیٰ

مطالعہ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کا حصہ ثانی

مباحثِ ایمان

قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

سورۃ فاتحہ

(۱)

السلام علیکم - نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ

اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ع

اٰمِیْنَ ۝ صدق اللّٰہ العظیم

"کل شکر اور کُل ثنا کا سزاوارِ حقیقی اللہ ہے جو پوری کائنات کا مالک اور پروردگار ہے - بہت رحم فرمانے والا اور نہایت مہربان ہے - جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے اے رب!

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے ۔ (اے ربّ!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی ۔ راہ ان کی جن پر تیرا انعام ہوا جو نہ تو مغضوب ہوئے کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو نہ گمراہ ہوئے" آمین یارب العٰلمین ۔

حاضرین کرام اور ناظرین گرامی!

آج کی نشست میں اس سورہ مبارکہ کے بارے میں مجھے پہلے تو تمہیدی باتیں عرض کرنی ہوں گی ۔ میں چاہوں گا کہ آپ ان کو گن کر اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور یاد رکھنے کی کوشش کریں ۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتدا میں شامل ہیں ۔ وہ سب سے پہلی وحی ہے ۔ اس پر تقریباً اجماع ہے ۔ اکثر متقدمین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورۂ "ن" (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں ہیں ۔ پھر سات آیات جو سورہ المزمل کے شروع میں ہیں، تیسری وحی ہے ۔ پھر سات ہی آیات جو سورہ المدثر کے آغاز میں ہیں، وہ چوتھی وحی ہے ۔ اور پانچویں وحی جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی وہ یہ سورۂ فاتحہ ہے جو مکمل سورت ہے ۔ پھر یہ حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے ۔

دوسری بات اس سورہ مبارکہ کی عظمت سے متعلق ہے ۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالےٰ کا اپنا فرمان ہے ۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے : وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ آیت ۸۷ "(اے نبی)، اور تحقیق ہم نے آپؐ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں" یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں ۔ نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے ۔ "ہم نے آپؐ کو قرآن عظیم عطا فرمایا" ۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ سے مراد

سُورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس آیت میں "اَلْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ" بھی سورۃ فاتحہ ہی کو کہا گیا ہے۔ گویا اس سورہ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ اس طرح یہ خود اپنی جگہ ایک مکمل قرآن ہے اور نہ صرف قرآن بلکہ "قرآنِ عظیم" ہے۔
سُورۃ الحجر کا یہ مقام جس میں یہ آیتِ مبارکہ وارد ہوئی ہے، وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں تو ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی جتلا رہے ہیں کہ اے نبیؐ ہم نے آپؐ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے کہ جس سے بڑی نعمت کسی اور نبی کو نہیں دی گئی اور وہ نعمت ہے۔ سورۃ فاتحہ۔

اس سُورہ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں میں چاہوں گا کہ ایک حدیث بھی آپ کو سنا دوں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے بارے میں نبی اکرمؐ نے فرمایا: اَقْرَأُ هُمْ قَرَأْنَا اُبَیُّ اُبْنُ کَعْبٍ" "صحابہ میں قرآن کے سب سے بڑے قاری ابی ابن کعبؓ ہیں"۔ ان ہی سے خود نبی اکرمؐ نے سوال کیا کہ "اے اُبیّ! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن مجید میں ہے؟" جواب میں حضرت ابیّ ابن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا "حضورؐ ضرور فرمایئے"۔ اس پر حضورؐ نے دوسرا سوال کیا۔ "تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟" حضرت ابیّ نے جواب میں سورہ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی۔ تو اس موقع پر نبی اکرمؐ نے فرمایا "یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی کوئی اور مثل و نظیر موجود ہے"۔ (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

تیسری بات اس سورۃ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور عام نام ہے۔ "الفاتحہ"۔ فَتَحَ یَفْتَحُ کے معنی ہیں "کسی چیز کو کھولنا"۔ لہٰذا الفاتحہ کے معنی ہوئے "قرآن مجید کی افتتاحی سورت The Opening surah of The Quran یہ نام تو گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورت ہے۔ باقی عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں

خاص محبت ہوتی ہے تو وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں چنانچہ اس سورہ مبارکہ کے بھی آپ کو بے شمار نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اور اس کی جامعیت کے اعتبار سے اسے "اُمّ القرآن اور اساس القرآن" بھی کہا گیا۔ یہ سورہ گویا قرآن مجید کے لئے اساس اور بنیاد اور جڑ کے مرتبہ اور مقام کی حامل سورہ ہے — اس کو 'الکافیہ' کا نام بھی دیا گیا۔ یعنی یہ کفایت کرنے والی سورہ ہے — اسے 'الشافیہ' کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ یعنی اس میں شفاء ہے۔ اس کے اور بھی نام ہیں، میں چند نہایت مشہور ناموں کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔

چوتھی بات اس سورۃ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے — اس کا انداز دعائیہ ہے۔ اگرچہ کلام الٰہی ہے لیکن اسلوب سکھانے کا نہیں ہے بلکہ تلقین کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ اس اسلوب میں انسان کی فطرت سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی۔ گویا یہ سورہ مبارکہ تراز شکر و سپاس اور حمد و ثنا بھی ہے۔ اس میں اللہ کی ربوبیت کاملہ اور اس کے مالکِ ارض و سما ہونے کا اقرار بھی ہے۔ اللہ کے رحمان و رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اللہ کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختارِ کل، نیز اس کے عادل و منصف اور حاکم مطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ اس میں صرف اسی کی بندگی اور پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید براں اس میں اسی سے صراط مستقیم پہ گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے گویا اس میں اُن لوگوں کی راہ پہ اللہ سے چلانے کی دعا بھی ہے۔ جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ بلکہ جو منعم علیہم ہیں۔ یعنی جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندے ہیں — گویا کہ اس سورہ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لئے ایک دیباچہ بنا دیا گیا — قرآن حکیم سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ ہے انسان کی فطرت کی پکار اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کر رہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جس ہدایت کی طلب ہے۔ وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے — اس

طلب اور دُعائے ہدایت کا جواب ہے وہ کتاب جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی - الٓمّٓ ۰ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۰ "الٓمّٓ، یہ کتاب الٰہی ہے - اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں ہے، یہ خدا ترس لوگوں کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے" اس طرح یہ سورۃ مبارکہ ایک طرف فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے، دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط و تعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے مقدمہ یا دیباچہ کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے - گویا سورہ فاتحہ ایک دعا ہے جس میں تہلیل و تحمید اور قول و قرار کے ساتھ صراطِ مستقیم کی ہدایت طلبی ہے اور اس دعا کا جواب پورے قرآن مجید میں موجود ہے -

پانچویں بات بہت عام ہے - آپ تمام لوگوں کے علم میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ یہ سورہ مبارکہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے - نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے جو متفق علیہ ہے یعنی جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ "اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی" ایک اور حدیث قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور امام مسلمؒ اُسے اپنی صحیح میں لائے ہیں - طویل حدیث ہے - جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی - اس حدیث کی رو سے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ "میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے مابین دو برابر برابر نصف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے" جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس حدیث کا ذکر بعد میں بھی آئے گا اس موقع پر اس ٹکڑے پر اکتفا کیجئے - اس کے بعد اس حدیث میں سورہ فاتحہ کی تفصیل آئی ہے - پس معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ - اصل نماز یہی سورہ فاتحہ ہے - اس معاملہ میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے -

البتہ اس معاملہ میں جو اختلاف ہے اُسے چھٹی بات کے طور پر ذہن نشین کر لیجئے - یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر

ائمہ دین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ اجمعین کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم سے چلے آرہے ہیں - ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اُسے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیئے یا نہیں - ! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورت تو ہر شکل میں پڑھنی ہے ہر رکعت میں پڑھنی ہے - امام کو بھی پڑھنی ہے، مقتدی کو بھی پڑھنی ہے - جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سرّی رکعات میں بھی — ایک رائے اس کے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام تو لازماً سورہ فاتحہ پڑھے - لیکن مقتدی قطعی نہیں پڑھیں نہ جہری رکعات میں نہ سرّی رکعات میں — امام ہی کی قرأت مقتدیوں کی طرف سے سورہ فاتحہ کی قرأت ہو جائے گی - جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے - تو اس وفد کا جو قائد یا ترجمان (Leader or spokesman) ہوتا ہے - وہ جو بات کرتا ہے، وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے — ایک بین بین کی رائے بھی ہے - وہ یہ کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورہ فاتحہ کی قرأت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سرّی رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قرأت کریگا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے - ان آراء کے حاملین کے پاس اپنے اپنے مسلک و موقف کے لئے نہایت مضبوط و مبسوط دلائل موجود ہیں — اس معاملہ میں جو بات میں اپنے ناظرین سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے لئے ہمیں اپنے سینے کو کشادہ رکھنا چاہیئے - یہ اختلافات خلوص پر مبنی ہیں - سب صحیح بات تک ہی پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا کہ سب کے پاس اپنے موقف کے لئے دلائل موجود ہیں - یہ فروعی اختلافات ہیں - دین کی اصل روح سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے - ہر رائے افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہے - جس کے متعلق اہل سنت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص مخطی اجتہاد بھی اللہ کے یہاں موجب اجر ہوگا اور اگر اجتہاد مصیب ہے تو اس پر دُہرا اجر ملے گا -

اب میں خصوصی طور پر جو بات آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورہ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اُسے لازماً ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ اس کی طرف سے بھی سورۃ فاتحہ کی امام قرأت کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے گویا اس کی طرف سے بھی قرأت ہوگئی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو ہر رکعت میں یہ سورہ پڑھنی ہوگی ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری رکعت میں خاموش رہے گا البتہ سرّی رکعت میں پڑھے گا۔

ساتویں بات اس سورہ مبارکہ کی آیات کی تعداد کے بارے میں ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورت کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیات کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام فقہی مسالک کے نزدیک سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ کی مصداق یہ سورہ مبارکہ ہے لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں تو اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام آیت بسم اللہ کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک سورۂ فاتحہ شروع ہوتی ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے بعض حضرات علماء بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو نہیں مانتے انکے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے۔ جو سورہ برأت (توبہ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے لیکن اس سورہ کا جزو نہیں ہوتی۔ یہ رائے رکھنے والوں کے نزدیک سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ——— کے کلماتِ مبارکہ سے ——— لیکن پھر بھی دونوں کے نزدیک آیات کی تعداد سات ہی ہے۔ جو لوگ آیت بسم اللہ کو اس سورہ میں شامل کرتے ہیں وہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کو ایک آیت مانتے ہیں۔ اس طرح آیات کی تعداد سات ہی رہے گی ——— جو حضرات اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے اس سورہ مبارکہ کا آغاز تسلیم کرتے ہیں وہ آخری حصے کو دو آیات پر مشتمل مانتے ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ

اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ - ایک آیت اور غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝ علٰحدہ دوسری آیت اس طرح بھی آیات کی تعداد سات ہی رہتی ہے[1] - جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ علماء اور قراء کے مابین خلوص سے بھی اختلاف رائے ہوتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے - اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے - اگرچہ وزنی رائے وہ ہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں بسم اللہ شامل نہیں ہے اور اس کا آغاز اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ سے ہوتا ہے - اس لئے کہ اس کی پشت پر وہ حدیث قدسی ہے جس کا میں قدرے تفصیل کے ساتھ آگے ذکر کروں گا اور جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ قَسَمۡتُ الصَّلٰوةَ بَيۡنِيۡ وَبَيۡنَ عَبۡدِيۡ نِصۡفَيۡنِ - اس کے بعد اس تقسیم کا ذکر ہے پھر بات آگے بڑھتی ہے تو اس میں آیت بسم اللہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ براہ راست الحمد للہ سے بات آگے بڑھتی ہے کہ جب بندہ کہتا ہے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ - تو اللہ تعالٰی جواب میں فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری حمد کی" اِذَا قَالَ الۡعَبۡدُ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ قَالَ اللّٰهُ حَمِدَنِيۡ عَبۡدِيۡ — تو آیت بسم اللہ کا ذکر یہاں موجود نہیں ہے -

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے تین حصے ہیں - اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں - لیکن نحوی اعتبار سے گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین بنتے ہیں - پہلی تین آیات اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝ —— گرامر کی رو سے یہ ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے - اس میں اللہ تعالٰے کی حمد و ثنا ہے اس کی صفات رحمانی و رحیمی اور عدل و قسط کا بیان

---

[1] مصحف میں عام طور پر یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ کے بعد آیت کی اختتامی علامت نہیں ہوتی بلکہ وہاں ۝ لکھا ہوتا ہے - یہ دراصل اسی اختلاف کے باعث ہے - (مرتب)

ہے۔ پھر چوتھی آیت جو اس سورہ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے یہ خود ایک مکمل جملہ ہے بلکہ اس کے مزید تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہرحال یہ ہے جملہ فعلیہ خبریہ — اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اے رب ہمارے! ہم صرف تیری ہی بندگی اور پرستش کرتے ہیں اور کریں گے۔ اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔" یہ رب اور بندے کے مابین ایک قول و قرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں لہٰذا یہ جملہ فعلیہ خبریہ درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔ تیسرا حصہ جو تین آیات پر مشتمل ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ "اے رب ہمارے! ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش، ان لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔" یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ جملہ انشائیہ ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔ ایک بندہ اس میں اپنے رب سے جس کی وہ تہلیل و تمجید کر چکا، جس کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمی اور عدالت کا وہ مقر ہو چکا۔ جس سے وہ عبادت و استعانت کا عہد استوار کر چکا، اب اسی رب سے وہ اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لئے "صراط مستقیم" یعنی زندگی بسر کرنے کیلئے معتدل و متوازن طرز زندگی اور راہ عمل کا طلب گار اور مستدعی ہے۔

اس موقع پر میں چاہوں گا کہ نویں اور آخری بات کہنے سے قبل آپ کو وہ حدیث قدسی ترجمہ کے ساتھ سنا دوں جس کا ذکر پہلے دو بار ہو چکا ہے۔ جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ میں حدیث اور ترجمہ ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ توجہ سے سماعت کی درخواست ہے۔ حدیث شروع ہوتی ہے کہ: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ "حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔" قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ۔ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا

ہے۔" فَنِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ۔" اس کا نصف حصہ میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے۔ اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔" جب بندہ کہتا ہے" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔ قَالَ اللّٰهُ حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ۔" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی، میرا شکر ادا کیا۔" اور جب وہ کہتا ہے" اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" قَالَ اللّٰهُ اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ" میرے بندے نے میری تعریف و ثنا کی" اور جب وہ کہتا ہے" مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ۔" میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی"۔ یہ پہلا حصہ کُل کا کُل اللہ کے لئے ہے۔ جب بندہ دوسرا جملہ، دوسرا حصہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ادا کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ۔" یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اس نے مانگا۔" یہ حصہ ایک معاہدہ ہے۔ قول و قرار ہے۔ اس میں بندے نے کچھ طلب بھی کیا ہے۔ مدد چاہی ہے۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ میں نے اپنے بندے کو دیا جو اس نے مجھ سے مانگا۔ اب آخری حصہ رہ گیا یعنی جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ۔" یہ میرے بندے کیلئے ہے، یہ اس کا حصہ ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا۔" اس حدیث کی رو سے سورہ فاتحہ کے تین حصے بن جاتیں گے۔ اگر ان تین حصوں کو تقسیم کریں گے تو نصفین آدھا حصہ اللہ کے لئے ہے اور آدھا حصہ بندے کے لئے ہے اور درمیانی و مرکزی آیت: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بندے کے اللہ سے ایک قول و قرار اور ایک عہد و معاہدہ سے متعلق ہے چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ۔" یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک

ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے طلب کیا۔"

اس سورہ مبارکہ کے بارے میں نویں جو آخری بات مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ کے اختتام پر "آمین" کہنا مسنون ہے۔ آمین، کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ ایسا ہی ہو"۔ جیسا کہ اس سورۃ مبارکہ کے اسلوب کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا اسلوب دعائیہ ہے لہٰذا اب دعا کے اختتام پر "آمین" کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ "اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے۔ تو اسے شرف قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔

یہ وہ باتیں ہیں جو اس عظیم ترین سورہ کے بارے میں، میں نے تمہیداً عرض کی ہیں۔ اب اس ضمن میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ اس سورہ میں شفاء ہے تو یہ شفاء کس معنی میں ہے۔! آیا یہ جسمانی شفاء ہے یا روحانی۔؟

جواب: بہت اچھا سوال ہے۔ قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ شفاء بھی قرار دیتا ہے چنانچہ سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ "اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، اور شفاء بھی دلوں کے امراض، کے لئے اور رہنمائی اور رحمت ان کے لئے جو اس پر ایمان لے آئیں" سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۲ میں فرمایا گیا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا "اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور ظالموں (یعنی شرک کرنے والوں) کے لئے تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے"۔ یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے، وہ ذہنی و فکری شفاء ہے۔ انسان کی سوچ کو درست اور صحیح کرنے والی کتاب کتاب الٰہی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجئے کہ انسان

کے ذہن اور جسم میں بہت گہرا ربط ہے - ذہن و فکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں - آپ کے علم میں ہوگا کہ آج کل کے دور میں امراضِ ذہنی اور نفسیاتی امراض کا زیادہ چرچہ ہے - لہٰذا اگر فکر صحیح ہوگا، سوچ درست ہوگی تو لازماً انسان کو اس کے ذریعہ جسمانی تندرستی بھی حاصل ہوگی - اس پہلو سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورہ مبارکہ بھی — پھر چونکہ سورہ فاتحہ پورے قرآن حکیم کا خلاصہ ہے - یہ اُم القرآن اور اساس القرآن ہے لہٰذا اس کا نام 'الشافیہ' بھی ہے - اس میں یقیناً مومنین کیلئے ذہنی و قلبی شفاء موجود ہے - مزید براں یہ کلام اللہ ہے لہٰذا اس پر کامل و اکمل یقین رکھنے والوں کے لئے اس کی تاثیر میں جسمانی طور پر بھی شفاء ہونا مستبعد نہیں ہے - اس سورہ کا جسمانی شفاء ہونے کے لحاظ سے بھی حدیث میں ذکر ملتا ہے -

سوال : ڈاکٹر صاحب! سورہ فاتحہ کو اُم القرآن جو کہا جاتا ہے تو کیا واقعی اس سورت میں قرآن کے تمام علوم اور معلومات کا نچوڑ آگیا ہے - ؟

جواب : اصل میں تمام علوم یا تمام معلومات کا نچوڑ تو نہیں کہیں گے لیکن جیسا کہ سورہ لقمان کے دوسرے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک اپنی حکمت ہے، اس کا ایک اپنا جدا فلسفہ ہے - حکمتِ قرآنی کا لب لباب اور نچوڑ یقیناً سورہ فاتحہ ہے - قرآن حکیم کا جو اپنا فلسفہ اور طرز استدلال ہے اس کا جوہر، اس کا خلاصہ اور اس کا حاصل بھی یہ سورہ مبارکہ ہے — ظاہر بات ہے کہ ہر فلسفے اور نظریے میں اس کی جو اصل فکری اساس ہوتی ہے، اُسی کو بنیادی اہمیت بھی حاصل ہوتی ہے - ہمارے دین اور قرآن حکیم کی جو فکری اساس اور اس کی جو حکمت اور فلسفہ ہے جس پر ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے تو اس اعتبار و لحاظ سے یقیناً سورہ فاتحہ اُم القرآن اور اساس القرآن ہے -

سوال : ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ ہر نماز کی ادائیگی کے لئے جزو لاینفک ہے تو آیا آمین کہنا بھی جزو لاینفک ہے یا نہیں ؟ پھر اسکو اونچی آواز سے کہا جائے یا نیچی آواز سے ؟

جواب : آپ نے اچھا کیا کہ یہ سوال پوچھ لیا چونکہ اس کا تعلق عملی مسائل سے ہے - آمین کہنے پر سب کا اتفاق ہے - سب کے نزدیک آمین کہنا ضروری ہے - فرق صرف یہ ہے کہ اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے - دل میں کہی جائے یا زبان سے ادا کی جائے - تو یہ سب آراء رکھنے والوں کے پاس دلائل موجود ہیں - یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہی ہماری رہنمائی کے لئے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک آمین کہنا ضروری ہے

حضرات! آج کی اس مختصر نشست میں وہ عظیم و بابرکت سورت جو ہماری نماز کا جزو لازم و لاینفک ہے اور جو ہر مسلمان کو لازماً یاد ہونی چاہیئے، اس کا ترجمہ اور اس کے بارے میں چند تمہیدی و بنیادی باتیں ہم نے سمجھی ہیں - اللہ تعالیٰ اس کو اس بات کے لئے ذریعہ بنادے کہ ہماری نمازوں میں جان، خشوع و خضوع اور حضوری قلب پیدا ہو جائے اور ہم جب اپنی نمازوں میں سورہ فاتحہ کی قرأت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی و قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورہ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں اور دل کی گہرائیوں سے اس کے آرزومند ہوں کہ اس سورہ کے ذریعہ جس صراط مستقیم کی رہنمائی کی استدعا کی جاتی ہے — وہ راہ ہمیں حاصل ہو جائے اور اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہ ربانی سے ہمیں ارزانی ہو - آمین یارب العالمین -

اَب ان شاء اللہ العزیز ہم آئندہ نشستوں میں ان تین اجزا کا جو میں نے آج بیان کئے ہیں علٰحدہ علٰحدہ بطریق تذکّر و تدبّر مطالعہ کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات -

(آیت ۲۹) جس کے لئے وہ کوئی سفارش سننا چاہے اور اس کو پسند کرے

سورۃ النباء میں عدالتِ اُخروی کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح فرمایا:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	اس (شدنی) دن جس روز روح (جبریل)
صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ	اور دیگر ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے۔
الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ط	کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن
(آیت ۳۸)	اجازت دے اور جو درست اور صحیح بات کہے۔

اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ شفاعتِ مطلقہ کا عقیدہ، باطل عقیدہ ہے، مشرکانہ عقیدہ ہے۔ چونکہ اس طرح بندے کا اعتماد اللہ کے بجائے مخلوق میں سے کسی بندے پر جم جاتا ہے، وہ عمل سے غافل ہو جاتا ہے۔ پھر اس طرح دو مشیتیں اور دو قدرتیں تسلیم کرنا لازم آتی ہیں جو شرک فی الصفات ہے۔

شفاعت کے بارے میں قرآن مجید جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے، ان کے اعزاز و اکرام کے اظہار کے لئے جس کو چاہے گا اور جس کے لئے چاہے گا، شفاعت کی اجازت دے گا۔ یعنی اصل مشیت و رضا اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور شفاعت کرنے والا خدا سے ڈرتے ہوئے وہی بات کہے گا جو حق ہوگی، اور ان ہی کے حق میں شفاعت کرے گا جن کے حق میں شفاعت کا قبول کرنا اللہ کی مشیت میں شامل ہوگا۔ یہ ہے توحید۔ اس سے ہٹ کر جو کچھ نظریہ ہے وہ اللہ کی قدرت اور اللہ کی مشیت میں شرک ہے۔

(باقی آئندہ)

اِسلام کا جماعتی نظام

یہ مقالہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام امسال منعقدہ محاضراتِ قرآنی کے خصوصی پروگرام میں پڑھا گیا۔

از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن نبوی

یہ وسیع و عریض کائنات اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک خاص ترکیب و تالیف کے طفیل قائم ہے۔ آج سے پہلے بہت سی چیزوں کو بسیط سمجھا جاتا تھا اور ان کو مرکب اشیاء کا بنیادی میٹریل قرار دیا جاتا تھا لیکن مسلسل تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود بسائط نہیں بلکہ مرکبات ہیں بلکہ ان کے اجزاء اور اجزاء الاجزاء بھی مرکبات ہیں تا آنکہ مادہ کا وہ ذرہ بے مقدار جس کو جوہر اور ایٹم کہا جاتا ہے وہ بھی ترکیب و تالیف کا مرہون منت ہے اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ خود ترکیب فرع ہے اجتماع کا، یعنی اولاً کسی چیز کے منتشر اجزاء یکجا اور مجتمع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک خاص ہیئت میں جڑ کر ایک دوسرے سے تعلق پیدا کر دیتے ہیں جس سے ایک کُل وجود میں آجاتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ واجب الوجود کے سوا ممکنات کا کوئی فرد نہ صرف یہ کہ اجتماع سے خالی نہیں بلکہ اجتماع ہی کے بل پر موجود ہوا ہے۔

اس سلسلے میں اگرچہ قدیم و جدید طبیعیات کی وہ بحثیں کچھ تردد پیدا کر سکتی ہیں جو کئی ممکن چیزوں کی بساطت کا بھی تاثر دیتی ہیں لیکن قرآنی ارشاد "وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ" نے کائنات کی وسعتوں اور نزاکتوں پر جس انداز سے متنبہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی علمی و فکری اور سائنسی و تجرباتی کاوشوں کے باوجود جس طرح سے انسان اس کائنات کے اجزائے ترکیبی کا احاطہ نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے جس کا اس فن کے محققین کو برملا اعتراف ہے اسی طرح سے وہ اسکے اجزائے تحلیلیہ کے کامل ادراک سے بھی عاجز و درماندہ ہے اور اس سمت میں اس نے جن جن چیزوں کو بسائط قرار دے کر تخلیق و تکوین کا نکتۂ آغاز سمجھا ہے آج نہیں تو کل انہیں چیزوں کی ترکیب و تالیف ظاہر ہو کر اس کو اسی طرح جھٹلا دے گی جس طرح اس سے پہلے بہت سے مراحل پر جھٹلایا گیا ہے۔

بہرحال فی الجملہ اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر مخلوق شئے میں وجود و اجتماع دو ایسی ہی متلازم حقیقتیں ہیں جیسے انسان میں حیوان اور ناطق کہ اگرچہ مفہوماً تو دونوں باہم متغائر ہیں لیکن مصداقاً بالکلیہ متساوی اور مترادف ہیں، گو منطق و فلسفہ کی رو سے اس تشبیہ میں یہ خامی ضرور موجود ہے کہ حیوان اور ناطق تو ماہیتِ انسانیہ کے اجزائے واقعیہ ہیں اور وجود و اجتماع میں سے وجود تو اگرچہ ایک امر واقعی ہے مگر ذات الحادث میں داخل نہیں بلکہ زائد علی الذات ہے اور اجتماع تو محض ایک نسبت اور انتزاع ہے تاہم سرسری تفہیم میں ان فروق کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

وجود ایک ارتقاء پذیر حقیقت ہے لہٰذا وہ ترقی کی جانب اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ ترقی کرتا جاتا ہے اس کی ضروریات کا دائرہ بھی پھیلتا جاتا ہے تا آنکہ جب ترقی کرتے کرتے جمادات و نباتات سے گزر کر حیوانیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس میں اپنا شعور اور احساسِ ذات پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی نوعی ضروریات بھی اس انداز سے بدل جاتی ہیں جس سے خود بخود اس کی اپنی اندرونی تکوینی اجتماع کے علاوہ ایک اور خارجی اختیاری اجتماع کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں تناسل اور تربیت و تحفظِ نسل کی ضرورت سے کم سے کم نر و مادہ کے ایک جوڑے کا اجتماع تشکیل پا جاتا ہے تاہم اسی حیوانی درجے میں بعض حیوانی انواع کے بے شمار افراد پر مشتمل بہت بڑے بڑے اجتماعات کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں جو حیرت انگیز حد تک مربوط و منظم ہوتی ہیں۔

وجود کے اس درجے میں گو شعور و ادراک کی وجہ سے اختیار و ارادے کا نمود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ردّ و قبول اور اخذ و ترک کی پوری پوری آزادی میسر ہوتی ہے لیکن اس کی ضروریات محدود اور دائرہ کار بہت تنگ ہوتا ہے اور وہ تھوڑی سی انفرادی یا اجتماعی حرکت سے اپنی آرزوئیں پوری کر کے مطمئن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا اختیار و ارادہ جسمانی قوتوں کے استعمال کے چند لگے بندھے ضابطوں ہی میں بروئے کار آتا ہے، اسی تنگی و یکسانی کی بدولت ان کے اجتماعی اعمال کو بھی اکثر و بیشتر فطرت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اختیار کی بجائے اضطرار کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس کے بعد وجود انسانیت کی سرزمین میں قدم رکھتا ہے جہاں اس میں شعور کیساتھ ساتھ عقل کا نور بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت اس کا مطمحِ نظر محسوس و مشاہد گرد و پیش

سے ماورا تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے اندر ہمہ گیری کے تقاضے ابھر آتے ہیں جن کو پورا کرنے کیلئے اس کی انفرادی جد وجہد قطعاً ناکافی ہوتی ہے چنانچہ ایک ایسے جماعتی نظام کی نیو رکھتا ہے جو تحصیل مقاصد میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوئی کہ وجود کی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماع میں بھی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ جب وجود نے انسان کی شکل اختیار کی تو اجتماع نے اولاً تہذیب و تمدن اور ثانیاً ریاست و حکومت کا روپ دھار لیا جس میں تہذیب و تمدن سے نسبتاً بڑھ کر اختیار و ارادے کی کارفرمائی ہوتی ہے کیونکہ تہذیب و تمدن میں انسان دوسروں کی دیکھا دیکھی غیر محسوس انداز سے ماحول کا اثر قبول کرتا ہے جبکہ ریاست و حکومت میں وہ پورے فہم و فراست کے ساتھ کسی شخص یا دستور کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

وجود و اجتماع کے آغاز و ارتقاء کی اس بحث کے ساتھ ساتھ یہ عقلی مسلّمہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی بھی چیز کا وجود اس کے لوازم ذات کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز موجود ہے تو گویا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو جو چیزیں اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں وہ سب موجود ہیں۔ ہم ابھی تک جس سیاق و سباق میں اجتماع کا ذکر کرتے رہے ہیں اس سے آپ نے معلوم کر لیا ہوگا کہ ہماری مراد وہ اجزائے مجتمعہ ہیں جن کے کل پر کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور اسی نتیجے کے حصول کے لئے یہ اجتماعی ہیئت تشکیل پائی ہو ظاہر ہے کہ اس قسم کا اجتماع امارت اور سمع و طاعت کے بغیر ممکن نہیں گویا یہ دو چیزیں اجتماع کے لوازم ذات میں سے ہیں، اب اس عقلی مسلّمے کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اجتماع کے ہر درجے میں اس کے یہ دونوں لوازم اسی درجے کے مناسب حال موجود ہیں کہ نہیں۔

ہمارے موجودہ علم نے جوہر (ATOM) کو تمام بے جان کائنات اور امیبا (AMOEBA) کو تمام جاندار مخلوقات کا سب سے پہلا درجہ قرار دیا ہے وجود کے ان ابتدائی مظاہر کا داخلی اجتماع امارت اور سمع و طاعت کا جو خوبصورت نمونہ پیش کرتا ہے معززین حاضرین اس سے بے خبر یقیناً نہیں ہوں گے دونوں جگہوں میں نیوکلس (NUCLEUS) یعنی مرکز امیر کی حیثیت سے بقیہ اجزاء کو کنٹرول کرتا ہے اور اجزاء اسی کنٹرول کے دائرے میں متعلقہ فرائض انجام دیتے ہیں لیکن یہ اجتماعات سراسر تکوینی ہیں لہٰذا اس کے لوازم یعنی امارت

اور سمع واطاعت بھی تکوینی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی قسم کی بدامنی اور بغاوت کا کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پولیس اور فوج کے شعبے نابود ہوتے ہیں۔

اس کے بعد وجود کے شعوری انواع میں جب شعوری اجتماعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو امارت اور سمع و طاعت میں بھی درجہ بدرجہ شعور اور اختیار و ارادے کا نمود ہونے لگتا ہے چنانچہ شہد کی مکھیوں کے اجتماع میں امارت عُسُوب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور سمع و طاعت کا جذبہ کارکن مکھیوں کو ناقابلِ یقین حد تک مستعد اور فعّال بنا دیتا ہے حیوانیات سے خصوصی شغف رکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان حیوانی جمعیتوں میں تقسیم کار اور کام چوری و سرتابی کی صورت میں سزا و سرزنش کا بہت محکم و مفصّل نظام بھی پایا جاتا ہے۔

وجود کے انسانی درجے میں جماعتی نظام اور اس کے لوازم کا پایا جانا اظہر من الشمس ہے لہٰذا اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، امکانی وجود کا ارتقائی تسلسل انسانیت پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد اس کے ملکی مراتب کا نمبر آتا ہے جس میں جمعیت اور اس کے لوازم کا تفصیلی طور پر سمجھنا موقوف ہے وجود کے ہر تحتانی سطح کا اس کے فوقانی سطح سے ربط و تعلق کے فہم پر، طوالت اور فنی مصطلحات سے سامعین کے اکتا جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس سلسلے میں علمائے ظاہر و باطن کی تحقیقات کو ضرور پیش کرتا لیکن جبکہ یہ اندیشہ موجود ہے تو قرآن و حدیث کے فقط ایک ایک اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے، سورۃ قدر کی آیت نمبر ۴ " تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا " میں ملائکۂ رحمت کے نزول کے سلسلۂ بیان میں روح القدس یعنی جبریلِ امین کا جس اہتمام شان کے ساتھ ذکر فرمایا گیا وہ اس عظیم حقیقت کی غمّازی کرتا ہے کہ روح القدس اس لامحدود جہاں کا مرکز ہے جو اس کے تمام اطراف و اکناف کو اپنے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی شعبہ جاتی جمعیتوں کا حال اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں کراماً کاتبین کے بارے میں صراحت ہے کہ ان میں دائیں کندھے والا امیر اور بائیں کندھے والا مامور ہوتا ہے اور سمع و طاعت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب تک امیر کی اجازت نہ ہو بائیں کندھے والا کسی گناہ کو ریکارڈ نہیں کرتا۔

اب تک کی معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ " الصمد " (بے نیاز) فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ممکنات سب کے سب محتاج ہیں چنانچہ بے شمار داخلی اور خارجی ترکیب ان کے اس احتیاجات کو باذن اللہ پوری کرتی ہیں گویا جماعتی نظام ممکنات کی فطرت ہے

جس کو " لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ " کے بموجب بدلا نہیں جا سکتا۔

انسانوں کے لئے خدا تعالیٰ کا پسندیدہ طریقہ اسلام کہلاتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اسی طریقہ کے رہبر و رہنما ہیں ان سب نے انسانی فطرت کو بدلنے کی کوشش ہرگز نہیں کی کہ اس کا بدلنا تو اس کے پیدا کرنے والے خالق نے خود ہی ناممکن بنایا اور بتلایا ہے ہاں اس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی محنت میں اپنی عمریں صرف کیں جماعتی نظام دوسری ممکنات کی طرح انسانیت کی بھی فطرت تھی جس کو وہ اپنے نفسانی مقاصد کے لئے بہت غلط انداز سے استعمال کرتی رہی، انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین نے اس فطرت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مقاصد اور ہیئت سازی کی اصلاح پر توجہ فرمائی۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے زمان و مکان کے اپنے اپنے دائرہ بعثت میں حاکمیت انسانیہ کی بجائے حاکمیت الٰہیہ کو اس کا مقصد وحید ٹھہرایا اور اس کی تصویر و تشکیل میں بھی انہیں احوال و ظروف کے مطابق تبدیلیاں کیں جن میں وہ کام کرنے پر مامور تھے۔ اس سلسلے میں خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے انبیاء میں فقط حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید کی یہ قطعی شہادت موجود ہے کہ آپ نے حضرت طالوت کو مستحق امارت قرار دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ " وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ یعنی جماعتی نظام میں امارت کا استحقاق قوت و بصیرت پر ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت طالوت میں موجود تھیں۔

انتخاب امیر کے سلسلے میں اس مختصر سے ارشاد میں اتنی جامعیت ہے کہ اس کے بعد اگر آسمانی ہدایت اس ضمن میں بالکل خاموش بھی ہو جاتی تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔ لیکن خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیلی اور اتمامی شان نے جہاں مسلمانوں کے جماعتی نظام کے مقصد میں مزید عظمت و شوکت پیدا کر دی اور " لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ " کا اعلان کر کے بتلا دیا کہ اب جماعتی نظام کا مقصد فقط ایک محدود آبادی میں نہیں بلکہ پوری انسانی دنیا میں اظہار اور غلبۂ دین ہے وہاں اس کی ہیئت سازی اور تشکیل بالخصوص آمر و مامور کے فرائض و حقوق اس قدر وضاحت و تفصیل سے بیان فرمائے کہ اس مسئلے کا کوئی گوشہ بھی مخفی باقی نہ رہا۔ نمونہ کے طور پر نبی علیہ السلام کی چند احادیث اور شیخین یعنی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی خطبوں کا ترجمہ

پیش کرتا ہوں۔

(۱) نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے قیامت کے دن سب سے زیادہ بلند مرتبہ وہ امام ہے جو سادا اور نرمی کرنے والا ہو اور بدترین وہ ہے جو ظالم اور سختی کرنے والا ہو۔

(۲) نبی علیہ السلام جب کسی کو امیر بنا کر کہیں بھیجتے تو ان ارشادات کے ساتھ روانہ فرماتے، "لوگوں کو خوشخبری سنایا کرو اور ان کو متنفر نہ کرو اور ہر معاملے میں یسر و سہولت سے کام لو۔ لوگوں کو مشقت میں نہ ڈالو۔"

(۳) سمع و طاعت ہر مسلمان مرد پر لازم ہے اس کی پسندیدہ باتوں میں بھی اور غیر پسندیدہ باتوں میں بھی جب تک کہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے اور جب گناہ کا حکم دیا جائے تو کوئی سمع و طاعت لازم نہیں خلیفہ ہونے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلا خطبہ دیا تو فرمایا:

"لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے جب تک کہ اس کا حق اسے نہ دلوادوں اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں۔ لوگو! میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں اگر تم مجھے سیدھی راہ چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کرو۔"

اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ابتدائی خطبے میں فرمایا:۔

"تمہارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے مال سے اس کے ولی کا ہوتا ہے اگر میں خوشحال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر تنگ دست ہوں گا تو جو میرا جائز حق الخدمت ہو گا وہ لے لوں گا میرے اوپر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو مجھ پر فرض ہے کہ تم سے خراج کی مد میں اور جس مال میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں فئے میں عطا فرمایا کوئی ٹیکس بیجا وصول نہ کروں اور تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں آئے وہ جائز مصرف کے سوا کسی اور صورت سے نہ نکلے۔"

معزز سامعین! اللہ تعالیٰ کو بندگی و اطاعت کا وہ انداز سب سے پیارا اور محبوب ہے جو سب سے زیادہ شعوری اور اختیاری ہو یہی وجہ ہے کہ انسانی طاعت پر جنت اور اس کی بے حد و حساب نعمتوں کے وہ وعدے ہیں جو کسی مخلوق کی طاعت پر نہیں۔

اسی حقیقت کے پیش نظر اسلام نے ہر عبادت کے آغاز میں کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ جس کے ذریعے سے انسانی شعور کو آخری حد تک بیدار کیا جا سکے اور وہ محض عادت کے طور پر نہیں بلکہ انتہائی گہرے احساس کے ساتھ اس عبادت کی بجا آوری کر سکے۔ چنانچہ نماز سے پہلے وضو، استقبال القبلہ اور تکبیر تحریمہ دوسرے بے شمار مصالح کے ساتھ ساتھ یہ مصلحت بھی پوری کرتے ہیں، حج میں احرام باندھنا جو کہ غیر معمولی لباس پہننے، وضو یا غسل کرنے، دو رکعت نماز پڑھنے اور زبانی نیت پر مشتمل ہے بھی تقریباً تقریباً اسی ضرورت کے تحت میں آتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس جماعت مؤمنین کی تشکیل جس کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کے دین کا اظہار اور غلبہ ہے بلاشبہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ چنانچہ اسلام نے اس میں شرکت کے لئے بیعت کا وہ طریقہ مقرر فرمایا جو منتشر خیالات کو یکجا اور بکھرے ہوئے ذہن کو یکسو کر کے جماعتی زندگی کے مقصد کا احساس تازہ کرا دے اور بندگیٔ رب کے جذبات و داعیات کو خوب خوب جھنجھوڑے۔

احادیث اور اس کی روشنی میں لکھی گئی سیرت و تاریخ کی تمام کتابوں سے ثابت ہے کہ نبوت کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسلام کی اپنی نشوونما کی زندگی تھی وہ خود ایک نرم و نازک کونپل کی صورت میں وادیٔ غیر ذی زرع کی سنگلاخ سرزمین کو شق کر کے نمودار ہوا تھا۔ ہر طرف اس کے روندے جانے کے اسباب بکھرے پڑے تھے اور وہ بہت دور دور سے اپنی غذا کھینچ کھینچ کر "اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ" کے مراحل طے کر رہا تھا، بالفاظ دیگر مکی دور میں انسانی آبادی کے صالح افراد کی وہ جمعیت اکٹھی کی جا رہی تھی جس کو ضروری تربیت کے بعد اقامتِ دین کی جد وجہد میں استعمال کیا جائے۔ اس کے برخلاف مدنی دور اظہار و غلبہ دین کے اصل کام کا فعلی اور عملی میدان تھا۔ اسی فرق کی بنیاد پر قرآن حکیم کے نزول کی ترتیب یہ رہی کہ مکی دور میں تو اساسی اصول یا نماز جیسی وہ فروع نازل ہوئیں جن کا زیادہ تر تعلق جماعتی ارتباط کے استحکام سے تھا اور مدنی دور میں اقامتِ دین کی لازمی ضرورت جہاد فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ روزہ ایسے احکام نازل ہوئے جو مجاہدے کے راستے

میں آنے والی مشکلات پر قابو پانے میں ممد و مددگار رہوں، مکّی اور مدنی زندگی کے اس امتیاز کے بعد میں آپ کو ایک اور امتیاز کی طرف متوجّہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مکّی زندگی میں جس نے بھی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہا کلمہ پڑھ کر کسی مزید اہتمام کے بغیر شامل ہوا لیکن مدنی زندگی کی تمہید بڑی عقبہ کی بیعتِ اولیٰ اور ثانیہ سے، سیَر کی تمام کتابوں میں مکّی زندگی کے کسی ملاقات کے واقعہ کو بیعت سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ یہ لفظ شہ سرخیوں کے ساتھ عنوان بنا ہے۔ اہلِ مدینہ کی پہلی اور دوسری ملاقات کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مکّی جماعت میں شمولیت کا رواج بیعت کے انداز پر نہ تھا۔ یہ مدنی جماعت میں شمولیت کی خصوصیت تھی۔

سامعین! اب مکّی اور مدنی زندگیوں کے ان دو امتیازات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر غور فرمائیں، کہیں اس میں یہ لطیف اشارہ تو نہیں کہ خود مسلمان بننے کے لئے تو بیعت کی ضرورت نہیں لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد میں شرکت کے لئے اس سے مخلص نہیں۔ اگر ایسا ہے تو ثابت ہوا کہ نہ صرف یہ کہ بیعت کا نظام عقلی طور پر جماعتی فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ اس کی پشت پر ایک بہت فکر انگیز نقل بھی موجود ہے۔

نبی علیہ السلام کے بعد مسلمانوں کی یک جماعتی زندگی خلافت کی صورت میں ڈھل گئی اس کے مقاصد واضح تھے۔ اور اقامتِ دین کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ لہٰذا چاروں خلفاء کی خلافت بھی بیعت کے طریقہ کار پر منعقد ہوئی اس کے بعد اقامت یا اظہار و غلبۂ دین کا تصور مضمحل ہونے لگا اور اب تو صدیاں ہوئیں یہ حال ہو گیا ہے کہ اسلام کے نام پر حکومتیں بنتی ہیں لیکن قرار داد مقاصد میں اظہار و غلبۂ دین کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہوتا اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عیّار و مکّار دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اکثر مسلمان بھی یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ فی الواقعہ اسلام اس معنی میں اپنا اظہار و غلبہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری حاکمیتوں کو مٹا کر اپنی حاکمیّت کا سکّہ جاری کرے۔ حالانکہ نبی علیہ السلام نے الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ کے صاف و صریح الفاظ سے "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا مورد و مصداق متعیّن فرمایا ہے۔

نبی علیہ السلام ہی کے زمانے میں بیعت کا ایک اور رُخ بھی سامنے آیا۔ ۶ ہجری

میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم و بیش چودہ سو صحابہ کو لے کر مکہ کو روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل مکہ کی طرف اپنی آمد اور طواف و زیارت کے ارادے کی بابت بات چیت کرنے کے لئے بھیجا۔ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں میں یہ افواہ پھیلی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر نبی علیہ السلام نے تمام مسلمانوں سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس بات پر بیعت لی کہ اگر حضرت عثمانؓ کو واقعتاً شہید کیا گیا ہو تو اہل مکہ سے اس کا انتقام لیں گے۔ شہادتِ عثمانؓ کی خبر تو غلط ثابت ہوئی لیکن بیعت کے بارے میں یہ ایک اور بات ثابت ہوئی کہ اقامتِ دین کے کل فرض کے علاوہ اگر کہیں نئے عہد و میثاق کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے اجزاء کے لئے بھی بیعت یعنی مشروع ہے اس عمل کے علاوہ نبی علیہ السلام کا ایک قولی ارشاد بھی اس معنی میں موجود ہے جس میں اعمال خیر پر بیعت کا ذکر موجود ہے:

عن ابی عثمان قال اخبرنی مجاشع بن مسعود السلمی قال جئت باخی ابی معبد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الفتح فقلت یارسول اللہ بایعہ علی الھجرۃ قال مضت الھجرۃ باھلھا قلت فبای شئ تبایعہ قال علی الاسلام والجھاد والخیر۔

ابو عثمان نقل کرتے ہیں کہ مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی ابو معبد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد لے گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ان سے ہجرت پر بیعت لے لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا ہجرت تو مہاجرین پر ختم ہو چکی۔ میں نے عرض کیا پھر کس چیز پر آپ بیعت لیں گے؟ آپؐ نے فرمایا اسلام پر، جہاد پر، اور نیک اعمال پر۔

(شرح نووی)

علامہ نووی اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہجرتِ ممدوحہ جو فضیلت و مزیت ظاہرہ کا سبب آپؐ کے اصحاب کے لئے تھی وہ فتح مکہ سے پہلے تھی لیکن فتح کے بعد ختم ہو گئی کیونکہ مقصد حاصل ہو گیا، البتہ دوسری باتوں یعنی امورِ خیر، جہاد اور اسلام پر بیعت لی جا سکتی ہے اور یہ چیزیں بجائے خود بہت بڑی اہمیت اور خصوصیت کی حامل ہیں

نبی علیہ السلام کے اسی قول و فعل کی بنیاد پر امت کے اندر کئی قسم کی بیعتیں مروج ہوئیں جن میں صوفیاء کی بیعتِ ارشاد کو بہت شہرت حاصل ہوئی چونکہ ان جزئی بیعتوں کی اصل

سنّت میں موجود تھی لہٰذا سلف وخلف میں سے کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمایا۔

امارت اور بیعت کے بارے میں ایک بحث یہ بھی کی جاتی ہے کہ کیا جماعت کا امیر جماعت کا افضل ترین شخص ہونا ضروری ہے یا اس کے ہوتے ہوئے کسی مفضول کو بھی امیر بنایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں ہماری اسلامی روایات سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فضیلتِ کُلّی تو بالکلیہ شرط نہیں البتہ زیرِ بحث جماعت کی غرض وغایت اور مناسب طریقہ کار کا علم وتجربہ ضروری ہے اور اس میں امتیاز وتخصص ترجیحی شرط قرار دیا جا سکتا ہے تاہم ترجیح کے اس امتیاز وتخصص کے بغیر دوسری بنیادیں بھی ہو سکتی ہیں جن پر خود نبی علیہ السّلام اور صحابہؓ و تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

جماعت اور اس کے لوازم کا مسئلہ صرف علمی اور نظری مسئلہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی کا اہم ترین عملی مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل سوالوں کا دوٹوک جواب تلاش کرنا بے حد ضروری ہے

(۱) جبکہ یہ معلوم ہے کہ اسلامی جماعت اظہار اور غلبۂ دین کی جدوجہد کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو کیا آج دنیا میں ٹھیک انہی خطوط پر مسلمانوں کی کوئی جماعت موجود ہے۔

(۲) اگر ہے تو ایک ہے یا متعدد۔

(۳) اگر ایک ہے تو وہ کونسی جماعت ہے اور اس کے ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کے انسلاک کی کیا شکل ہے۔

(۴) اگر متعدد ہیں تو کون کونسی اور کیا اس تعدّد کی اسلام میں گنجائش بھی ہے۔

(۵) اور اگر سرے سے ایسی کوئی جماعت موجود نہیں تو کیا پوری ملّت نبی علیہ السّلام کے ارشاد کی روشنی میں جاہلیّت کی موت مر رہی ہے۔

(۶) جاہلیّت کی اس موت سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے کہ نہیں۔

(۷) اگر ہے تو کونسی۔

(۸) اگر نہیں ہے تو " لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " کی کیا تفسیر ہے۔

حضرات یہ وہ سوالات ہیں جن کا دوٹوک جواب فراہم کرنا علمائے امّت کی سب سے اوّلین اور اہم ترین ذمہ داری ہے کہ اس کے بغیر صحیح ملّی زندگی ایک خوابِ پریشان ہے جس کا خارج میں کوئی وجود ممکن نہیں۔

جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ پوری ملت کا مسئلہ ہے جس پر فیصلہ کن گفتگو تو ان علمائے ملت کا مقام ہے جن کو رب تعالیٰ نے ظاہر و باطن کا عمیق علم عطا فرمایا ہو تاہم "چھوٹا منہ بڑی بات" کا مصداق بنتے ہوئے ہم اس کا ایک سرسری تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کسی کتاب میں نظر سے گزرا ہے کہ اسرائیل کے پارلیمنٹ ہاؤس کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

یہ نقل صحیح ہے یا نہیں کہنا یہ ہے کہ بلاشبہ اساسی مقصد کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے ایوانوں سے لے کر تمام ذیلی مراکز بلکہ ان صادق الحال لوگوں کے مکانوں سے بھی کسی نہ کسی انداز سے جھلکتا ہے جو اس مقصد کے ساتھ خالص مخلصانہ یا اس پر مستزاد ذمہ دارانہ تعلق بھی رکھتے ہوں، مطلب یہ ہے کہ اساسی مقصد کو تو پوری قوت اور ہر ممکن طریقے سے نمایاں کیا جاتا ہے کیا آج کی انسانی دنیا میں ایسی کوئی حکومت ہے جس نے ڈنکے کی چوٹ "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کو اپنی حکومت کا نصب العین قرار دیا ہو اور اسی کے مطابق ابتدائی سہی اپنے عملی پروگراموں کو مرتب کیا ہو۔ ہماری محدود معلومات میں تو نہ صرف یہ کہ ایسی حکومت نہیں بلکہ تمام قابل ذکر اسلامی ممالک نے اقوام متحدہ کا رکن بن کر اس مقصد سے مجموعی طور پر دستبرداری ظاہر کی ہے کیونکہ اس کے منشور کی سب سے اہم دفعہ یہی ہے کہ حریت اور آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جس کو کسی صورت میں بھی چھینا نہیں جا سکتا، معلوم ہوا کہ موجودہ اسلامی حکومتیں اس اسلامی جماعت کی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں جس کے لئے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے۔ یہ حکومتیں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی الگ الگ انتظامی یونٹیں کہلائی جا سکتی ہیں جنہیں جو اسلام کا سب سے زیادہ وفادار رہے اس نے اپنے دستور میں یہ دفعہ شامل کر لی ہے کہ "قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائیگا" لیکن ان کے اپنے عمل کے مطابق اس جملے کی صحیح تفسیر یا تاویل کی جا سکے گی کہ غلبۂ دین کے مقصد اعلیٰ سے برأت کے علاوہ قرآن و حدیث سے کوئی انحراف نہیں کیا جائے گا اور یا پھر اس کا مفہوم یہ بنے گا کہ قرآن و حدیث کے نہیں بلکہ اپنے تجویز کردہ مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

بہر حال حکومتوں کی سطح پر یہ بات واضح ہے کہ دین محمد علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی مطلوبہ جماعت موجود نہیں۔

اس کے بعد دنیا کی ان جماعتوں کا نمبر آتا ہے جو حکومتوں کے اندر اسلام کے نام پر بنتی ہیں۔ ان جماعتوں کے بارے میں تحقیقی بات کہنا بہت مشکل ہے اس لئے بھی کہ ان کے ذرائع محدود ہوتے ہیں پھر مقامی حکومتوں کی زد میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی پوری بات پہنچا نہیں سکتیں، اس کے اندر ہم یہ کلیہ مقرر کر سکتے ہیں کہ جو جو جماعتیں اظہار اور غلبۂ دین کے مقصد کے تحت کام کر رہی ہیں اور ان کے عمومی حالات بالخصوص قیادتیں ان کے دعوے کی واضح تکذیب نہیں کرتیں تو وہاں کے گرد و پیش کے مسلمان اس میں جڑ کر جماعتی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں، یہاں ہمارے مرتب کردہ سوالنامے کا چوتھا سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اس تعدد کی اسلام میں گنجائش بھی ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ممکن ہے کہ موجودہ دنیا اور مسلمانوں کی وسیع آبادی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ابتدا ہی سے ایک ہی جماعت کی صورت بن جائے ہاں صحیح بنیادوں پر کام کرنے والی یہ جماعتیں بالآخر ایک صورت میں ڈھل جائیں گی اور حالات و قرائن کچھ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ صورت ظہورِ مہدی اور نزولِ مسیح کی صورت میں نمودار ہوگی۔

حضرات! آپ نے یہ جان لیا ہوگا کہ ملی زندگی کی ضرورت اور اس کی عملی صورت کا جو مہتم بالشان مسئلہ میں نے آپ کے سامنے رکھا تھا ہماری رائے میں اس کا واحد حل یہی ہے جو آپ کے سامنے آگیا یعنی ہر جگہ کے مسلمان مصدقہ اسلامی تنظیم میں شامل ہو جائیں یا ایسی ہی تنظیم بنالیں اور پھر مقامی حکومت کے جائز انتظامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے اس کے حلقے کو بڑھائیں اور اگر حالات نے سازگاری کی اور اتنی قوت مجتمع ہوئی کہ یقینی طور پر مقامی حکومت بنائی جا سکے تو دریغ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ حکومت کے اصل حقدار وہ صالحین ہی ہیں جو خدا کی زمین پر خدا کا دین غالب کرنے کی محنت کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ مقامی جماعت مقامی حکومت حاصل کرنے کی قوت کیسے جمع کرے کیا مروجہ جمہوریت کا وہ یورپی انتخابی طریقہ جس میں حق و باطل کی بجائے محض کثرت و قلت پر حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں یا احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے قوت کا استعمال بھی ممکن ہے۔ یہی ہمارے اس مقالے کا سب سے زیادہ نازک ترین مقام ہے۔ اس سلسلے میں

ہماری ابتدائی رائے یہ ہے کہ اسلام قلت وکثرت کی تفریق پر کبھی فیصلہ نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ بالادستی حق کا پیدائشی حق ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے قوت کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔

اس پر یہ اشکال وارد کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو نام نہاد اسلامی حکومت کے خلاف خروج ہے جو باجماعِ امت ناجائز ہے۔ نام نہاد اس لئے کہ یہ بات آپ کے سامنے آچکی ہے۔ کہ فی الواقع اسلامی حکومت جو اس کے مقاصد کو ٹھیک ٹھیک پورا کر رہی ہو۔ عنقا ہے جس کا تصور تو ہے لیکن خارج میں کوئی وجود نہیں رکھتا اور دوسرے اس لئے بھی کہا کہ اس اجماع کی تفصیلات میں یہ قید لگاتے ہیں کہ جب تک کفر بواح کی مرتکب نہ ہو جس کا مفہوم مخالف یہ نکلتا ہے کہ فسق وفجور کی تو آخری حدود کو چھو رہی ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کو حقیقی اسلامی حکومت کہنا بدترین جھوٹ ہوگا۔

بہرحال تو مخالفتِ اجماع کا الزام سامنے آتا ہے مشہور حنفی المسلک عالم ملا علی قاری جو فقہ وحدیث میں یکساں طور پر مستند مانے جاتے ہیں، اس اجماع کا ذکر کرکے اس اجماع ہی پر دو اشکال وارد کرتا ہے۔

(۱) یزید کی خلافت یا حکومت کے خلاف حضرت حسینؓ نے کیسے خروج کیا۔

(۲) آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ہمارے اسلامی عقیدے کا جزو لاینفک ہے بے شمار اسلامی سلاطین کے ہوتے ہوئے وہ تمام مسلمانوں کو اپنی امارت پر کیسے جمع کرے گا۔

علامہ نے پہلے سوال کا جواب تو یہ دیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا خروج اس اجماع سے پہلے تھا لیکن دوسرے اشکال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

اس کا کوئی جواب فراہم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں مولانا نے جو اشکال وارد کیا ہے اس کی ذرا توضیح کر دوں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نزول فرمائیں گے اور اپنے دینِ عیسوی کی نہیں بلکہ دینِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پیروی فرمائیں گے اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اتنا اضافہ اور بھی فرمایا ہے کہ وہ دین محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چار عملی طریقوں میں سے بھی حنفیت پر کاربند رہیں گے تو

ان حقائق کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسرے مسلمان حکمرانوں کے باوجود اپنی امارت پر لوگوں کو کیسے جمع کریں گے۔

سوال کی اس تفصیل کے بعد ہم اپنا جواب سامعین کے سامنے رکھتے ہیں۔ اگر صواب ہے فمن اللہ اور اگر خطا ہے فمنی۔

اجماع امت کی تین قسمیں ہیں قولی، فعلی اور سکوتی۔ ان میں سے اوّل الذکر دو قسموں کا جامع عنوان ہے "عزیمت" اور تیسری قسم کو "رخصت" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اجماع کی تیسری قسم میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔ وہ اس کو اجماع تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ کسی ایک کی بات پر دو سروں کے خاموش ہونے کا لازمی طور پر یہ معنی نہیں نکلتا کہ ان کی رائے بھی یہی ہے بلکہ اس خاموشی کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم احناف اس کے قائل ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس قسم کا اجماع پہلی قسم کی طرح قطعی ہرگز نہیں، اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد منعقد ہونے والا اجماع سکوتی ہی ہو سکتا ہے کہ عالم اسلام کے پھیل جانے کی وجہ سے اور خود حاکم وقت کے خلاف خروج کی بیشمار رکاوٹوں کی بدولت اس میں پہلی صورت کے اجماع کے تمام شرائط کا پایا جانا بہت مستبعد ہے۔

اب اجماع سکوتی بھی کئی طرح کا ہو سکتا ہے مثلاً انقطاع اجتہاد پر اجماع ہے لیکن اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اب اس کے شروط کا پایا جانا تقریباً ناممکن ہے لیکن سب کو معلوم ہے کہ زمانہ قریب ہی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وہ مقام پیدا کیا کہ سب کے نزدیک اجتہاد کے مجاز ٹھہرے۔ چنانچہ انہوں نے کسی ایک مسلک کی کلی پابندی کی بجائے اصول و فروع میں ایک مخلوط انداز اختیار کیا۔ ٹھیک اسی طرح سے حرمت خروج کے اجماع میں بھی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ اس کا اکثری نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ تو اگر یہاں بھی اس بات کے یقینی اسباب پیدا ہو جائیں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم کی جا سکتی ہے تو قوت کا استعمال کیوں حرام اور ناجائز ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہ یقینی فضا قائم ہوگی لہٰذا وہ مسلمانوں کی سب سے مرکزی جماعت کی تشکیل فرمالیں گے۔ اسی انداز پر اگر کہیں مقامی جماعت مقامی حکومت کو یقینی طور پر لے سکے تو کسی اجماع کے خلاف لازم نہ آئیگا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

—۳—

شرک اور اقسامِ شرک

شرک فی الصّفات (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

قدرت و مشیّت

صفاتِ الٰہی کے ذیل میں مَیں اب دو اہم صفات یعنی قدرت اور مشیّت کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ قرآن مجید جس توحیدِ باری تعالیٰ کی دعوت دیتا ہے اس کا اہم ترین اقتضا یہ ہے کہ اس بات کو قلبی یقین کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ اُس کی قدرت اور مشیّت اس کی ذاتی اور مطلق (ABSOLUTE) ہیں جن پر کوئی تحدید نہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اور ——— اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ——— کا یہی مفہوم ہے

انسان میں جو بھی قدرت، طاقت اور قوتِ ارادی و عمل نظر آتی ہے، وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ بالکلیۃ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اور ابتلاء و آزمائش اور امتحان کی غرض چند حدود و قیود کے ساتھ اُس کو دی گئی ہے۔

اسی بات کو حضورؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے اُمّت کو تعلیم دینے کے لیے سورۂ کہف میں فرمایا کہ:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۙ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

اور (اے نبی!) کبھی یہ نہ کہنا کہ مَیں یہ کام کل ضرور کروں گا مگر اس (استثناء) کے ساتھ کہ اگر اللہ چاہے۔

(آیت ۲۳، ۲۴)

سورۃُ الدّہر میں فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ

اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک

اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ہ — اللہ نہ چاہے۔ بے شک اللہ بڑا علیم و[حکیم]
(آیت ۳۰) — ہے!

سُورۃ التکویر میں فرمایا:

وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ — اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب[تک]
اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہ — اللہ نہ چاہے جو سارے جہانوں کا ر[ب]
(آیت ۲۹) — (مالک و مختار) ہے۔

ان ہی ہدایات کے نتیجے میں حضورؐ نے اُمّت کو تعلیم دی کہ جب بھی کسی کام کی انجام [دہی کا] وعدہ اور ارادہ کرو تو اِنْ شَاءَ اللّٰہ ضرور کہا کرو۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ و کاملہ اور اس کائنات میں صرف اُسی کی ذاتِ [واحد] کی مشیّت کی کارفرمائی کا قرآنِ حکیم میں مختلف اسالیب کے ساتھ بار بار ذکر آیا ہے[۔ ان] میں سے چند کا حوالہ میں اپنی اس گفتگو میں متعدد بار دے چکا ہوں اور چند آیات میں[نے] ابھی پیش کی ہیں۔ ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت و مش[یت] پر کامل ایمان و ایقان عقیدۂ توحید کے اثبات میں اور شرک کے ابطال میں بنیادی [اور] اساسی معتقدات میں شامل ہے۔ لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ فرما کر واضح کر دیا [کہ] مخلوقات میں سے چاہے وہ انبیاء و رُسُل ہوں، چاہے وہ ملائکۂ مقرّبین ہوں، چاہے اولیاء اللہ اور صلحاء و اتقیا ہوں، چاہے وہ اجرامِ فلکی ہوں، گردشِ لیل و نہار ہو، وہ جنّا[ت] و شیاطین ہوں۔ الغرض ماسوا میں سے کسی میں نہ نفع پہنچانے کی کوئی ذاتی طاقت ہے [نہ] خیر پہنچانے کی۔ نہ ضرر پہنچانے کی ذاتی قدرت ہے نہ ضرر سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی، نہ کچھ دینے کی اہلیّت ہے نہ کچھ چھیننے کی۔ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا نہیں، کو[ئی] دست گیر نہیں، کوئی مولا نہیں، کوئی حامی و ناصر نہیں۔ صرف وہی ذات ہے جو نعم الم[ولیٰ] و نعم النصیر ہے اور اسی کی ذات وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ؕ کی شان کی حا[مل] ہے اور مطلق نافع و ضار بھی اُسی کی ذاتِ گرامی ہے ——— اگر مخلوق میں سے کوئی ایسی استعداد حاصل ہو گی تو وہ اذنِ ربّ اور مشیّتِ الٰہی کے تابع ہو گی، ا[ور] اسی حد تک ہو گی جس حد تک اللہ کی مشیّت چاہے گی اور وہ خالص عطائی ہو گی۔

نبی اکرمؐ کی مزید وضاحت: احادیث شریفہ میں مذکور ہے کہ ایک موقع پر نبی اک[رمؐ]

صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا :
"میرے بچے میں تم کو چند باتیں بتاتا ہوں اُن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو!" ان میں یہ بات بھی تھی کہ "اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ دُنیا کے سب لوگ مل کر بھی چاہیں کہ تم کو کوئی نفع پہنچائیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے پہلے سے طے کر دیا ہے۔ اور اگر سب لوگ مل کر بھی چاہیں کہ تم کو کوئی ضرر اور نقصان پہنچائیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر صرف اتنا جتنا اللہ کی طرف سے تمہارے لیے پہلے سے مقدر ہو چکا ہو۔" (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)
حاصل کلام یہ ہے کہ اذنِ رب اور مشیتِ رب سے آزاد ہو کر کسی میں کوئی طاقت نہیں کہ وہ کسی کو کوئی نفع و ضرر پہنچا سکے۔ کسی کی حاجت روائی کر سکے، کسی کی دست گیری کر سکے۔ یہ صرف اور صرف اللہ ہی کی ذاتِ بے ہمتا ہے جو کہ فعّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ اور یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ کی شان کی حامل ہے ـــــ ہماری بے چارگی کا عالم تو یہ ہے جن کا میں دو آیات کے حوالے سے ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ : وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط اس کے مطلب اور مفہوم کا ایک درجہ تو وہ ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا کہ : "تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو گا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔" اور اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ : "تمہارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے پر منحصر ہے!" تو اس کی بھی گنجائش موجود ہے اس کی نفی نہیں کی جا سکتی یعنی "چاہت" کا پیدا ہونا بھی اللہ کی مشیّت پر موقوف و منحصر ہے۔
پس قدرت، قوّت، مشیّت ان الفاظ کی حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور اگر یہ فرق و امتیاز قائم رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اُس کی صفات بھی مطلق اور غیر محدود و لامتناہی ہیں تو یہ توحید ہے۔ لیکن اگر اس میں التباس ہو گیا اور کسی درجہ میں بھی ان صفات کو غیر اللہ کے لیے مان لیا گیا تو یہ شرک فی القدرت، شرک فی القوّت اور شرک فی المشیّت ہو جائے گا۔

شفاعتِ مطلقہ یا باطلہ اللہ تعالیٰ کی ان صفاتِ قدرت و مشیّت میں التباس کے باعث ہمارے عالم نما جُہلا اور بے علم واعظین و شعراء میں شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ کا تصوّر پیدا ہوا۔ جس کی مسلسل نشر و اشاعت نے ہمارے دین سے ناواقف عوام و خواص کو ایک بہت ہی بڑی گمراہی و ضلالت میں مبتلا کر کے اُن کو دینی فرائض کی انجام دہی

سے غافل، اسلامی اخلاقیات سے عاری اور معصیت کا عادی و خوگر بنا دیا ہے اور ان کو ایسے اعمال و افعال میں مبتلا کر دیا ہے جو اسلام کی دعوتِ توحید، عبادتِ رب اور خلوص و اخلاص کے حقیقی مفہوم اور نجاتِ اُخروی کی ناگزیر شرائط کی بالکل ضد ہیں بلکہ اگر میں یہ عرض کروں کہ عقیدے سے لے کر عمل تک یہ تمام چیزیں مشرکانہ ہی نہیں بغاوت و طغیان ہیں تو بے جا اور غلط نہ ہوگا۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے بات بڑی تلخ کہی ہے لیکن اصلاحِ حال کے لیے صحیح تشخیص اور صحیح علاج ضروری ہوتا ہے اور بسا اوقات اس علاج کے لیے تلخ، کڑوی اور کسیلی ادویہ کا دیا جانا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ شرک فی الصفات کے ذیل میں، میں نے جو تین نکات، تین اُصول، اور تین فارمولے آپ کے سامنے رکھے تھے۔ ان پر میری معروضات کو جانچئے اور پرکھتے چلے جائیے۔ اگر میری بات ان کے مطابق ہو اور آپ کے دل کو لگے تو پھر ان کو تسلیم کیجئے اور اس کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے کہ کون سے عقائد ہمیں آباء و اجداد سے وراثتاً منتقل ہوئے ہیں اور ان کی پشت پر عوام و خواص کی کتنی عظیم اکثریت کی تائید موجود ہے۔ غلط بہرحال غلط ہے چاہے اس پر عمل کرنے والے لاتعداد و بے شمار ہوں۔ میں ابتداء ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ "علم توحید کے حصول کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ شرک اور اُس کی جملہ اقسام کی معرفت حاصل ہو جائے اور انسان یہ جان لے کہ شرک کن کن صورتوں میں حملہ آور ہوتا ہے اور کیسے کیسے بھیس بدل کر آتا ہے، کن کن راستوں سے توحید کی پونجی پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ شرک کے مکمل فہم کے حصول کے بعد ہی مسلمان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ اپنی حقیقی اور بیش بہا متاعِ ایمان کی حفاظت کر سکے۔ لہٰذا شرک اور اقسامِ شرک کی گفتگو تشنہ رہ جائے گی، اگر اس غلط عقیدے سے تعرّض نہ کیا جائے جو شفاعتِ مطلقہ بلکہ صحیح مفہوم کے مطابق شفاعت باللہ کی صورت میں ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت میں موجود ہے جو رُوح اور عمل دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ عقیدہ ہے۔

یہ عقیدہ کیا ہے؟ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ کچھ برگزیدہ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو خدا کے فیصلے کو بدلوا سکتی ہیں۔ خدا کے عدل و انصاف کے آڑے آسکتی ہیں۔ دربارِ خداوندی میں ان کا کوئی ایسا ذاتی مرتبہ، مقام یا منصب بھی

ہے کہ وہ اس کے بل پر مشیّتِ الٰہی اور اس کے فیصلوں کے بدلوانے میں اپنا زورِ اثر اور رسوخ استعمال کر سکتی ہیں یہ یقیناً خالص مشرکانہ تصوّر ہے۔ پھر خدا کی قدرت اور مشیّتِ مطلق کہاں رہی؟ اس تصوّر کے نتیجے میں تو مطلق قدرت و مشیّت اس کو حاصل ہوگئی جس کے لیے خدا کے فیصلوں کو بدلوانے کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔ اس طور پر تو خدا کی قدرت و مشیّت ہی نہیں بلکہ اس کی صفتِ عدل بھی مطلق نہ رہی بلکہ وہ بھی مقیّد ہوگئی اور نعوذ باللہ اس طرح تو اللہ عزّ و جلّ پر بھی اس کو فوقیت حاصل ہوگئی جس نے اللہ کے فیصلے میں روک لگا دی اور اس کو بدلوا دیا۔ اس اعتبار سے اس عقیدے نے اللہ تعالیٰ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر اُس کے سنگھاسن پر اُسے براجمان کر دیا کہ جس کیلئے اللہ کے فیصلوں کو بدلوانے کا اختیار مان لیا گیا۔ اسی تصوّر، اسی نظریہ، اور اسی عقیدے ہی کا دوسرا نام شرک ہے، جیسا کہ مَیں بالکل آغاز میں وضاحت کر چکا ہوں ـــــ یہاں میں اس بات کی بھی تصریح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مَیں اس شفاعت کا مقر اور قائل ہوں جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اور صادق و مصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے احادیثِ صحیحہ میں دی ہے۔ مَیں جس شفاعت کی نفی کر رہا ہوں وہ شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ ہے۔

قرآنِ حکیم سے شواہد قرآنِ حکیم میں جس شفاعتِ باطلہ کی نفی کی گئی ہے اس سے متعلق مَیں چند آیات پیش کرتا ہوں، پہلے اُن کو سُن لیجئے۔ بعدہٗ مَیں وہ چند آیات پیش کروں گا جن میں اذنِ ربّ کے ساتھ شفاعت اور اُس کے چند شرائط و لوازم کا ذکر ہے پھر مَیں اِن کی تشریح میں کچھ عرض کروں گا۔ شفاعتِ مطلقہ کی نفی کو سمجھنے کے لیے ان آیات پر تدبّر کیجئے۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (آیت ۴۸)

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائیگا اور نہ ہی اُن کی کوئی مدد کی جائے گی۔

اسی سورۂ مبارکہ میں بنی اسرائیل کو ایک دوسرے اسلوب سے متنبّہ کیا گیا: ـــ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (آیت ۱۲۳)

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا اور نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

پھر اسی سورۂ بقرہ میں اہلِ ایمان کو خبردار کیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (آیت ۲۵۴)

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اسی میں سے خرچ کرو۔ اُس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش ہی نفع پہنچائے گی۔ اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں

سورۃ الزمر میں فرمایا:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (آیت ۴۳-۴۴)

کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہہ دیجئے کیا وہ شفاعت کریں گے۔ جن کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہہ دیجئے کہ شفاعت تو کُل کی کُل اللہ کے لیے ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی تو اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے پھر اُسی کی طرف لوٹائے جانے والے ہو!

متذکرہ آیات میں جس شفاعت کی اتنی شدّ و مدّ اور اتنے مؤثر انداز میں نفی کی گئی ہے کہ یہاں تک فرمادیا کہ: قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ تو اس کی اصل غایت یہ ہے کہ مومنین صادقین چوکس اور چوکنے رہیں اور اُس غلط فہمی اور مغالطے میں مبتلا نہ ہوں کہ جس طرح دنیا میں دُنیوی لحاظ سے کوئی مقتدر اور بااثر شخصیت کسی مجرم کی سفارش کرکے اُسے سزا سے بچا لیتی ہے اور اس طرح بااثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنے

ے لوگ قانون کی گرفت سے بے پرواہ ہو کر جرائم میں جری اور دلیر ہو جاتے ہیں، اُسی طرح دالتِ اُخروی میں چند مقتدر اور اللہ کی محبوب ہستیاں محض ان سے نام کی نسبت رکھنے ی وجہ سے ان کی سفارش کر کے ان کو خدا کے عذاب اور گناہوں کی پاداش سے بچا لیں ی۔ علمی تجزیہ کیجئے تو بالکل واضح ہو جائے گا کہ یہ نظریہ اپنی اصل اور اپنی روح کے عتبار سے سراسر مشرکانہ نظریہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بظاہر تو کرسئ اقتدار پر للہ میاں ہی براجمان ہیں۔ لیکن ان سے بالاتر ہستی کوئی اور بھی موجود ہے جو اُن کے عدل میں آڑے آسکتی ہے، اُن کے فیصلے بدلوا سکتی ہے اور مجرمین کو اپنے کرتوتوں کی سزا اور عقوبت سے بچا سکتی ہے۔ اس طرح تو گویا نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ خدائے قہار کی قہاریت و جبروت اور اس کی عدالت کی کامل نفی ہو گئی اور اُسے بھی پارلیمانی طرز کی حکومت کے آئینی صدر کی حیثیت دے دی گئی کہ دستوری طور پر وہ ملک کا حقیقی سربراہ ہوتا ہے اور کوئی قانون اس کی منظوری کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ اپنی مرضی میں آزاد نہیں، وہ پارلیمانی کابینہ اور بالخصوص وزیرِ اعظم کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ فیصلہ وہ کرتے ہیں اور SHOW BOY کی طرح نفاذ صدر کے نام سے عمل میں آتا ہے۔ یا خدا کو دنیا کے ان بادشاہوں پر قیاس کر لیا گیا جو اپنے مقربین و مصاحبین کی سفارشات قبول کرنے پر اپنی بادشاہت کو بچانے کیلئے خود کو مجبورِ محض پاتے ہیں۔

التباس اور غلط فہمی کے اسباب | شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس نے قیامت تک انسان کو بہکانے کی مہلت مانگی جو اس کو بارگاہِ خداوندی سے مل چکی ہے۔ وہ انسان کو مختلف مغالطوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسان اسکے دامِ ہم رنگِ زمیں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ان مغالطوں میں ایک مغالطہ شفاعتِ باطلہ کا بھی ہے۔

یہود | یہود کو اُس نے اِس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ چونکہ ہم اللہ کے جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس دنیا میں بہت سے اکرام و انعام کی بارش کی ہے لہٰذا ہم اُس کے چہیتے ہوئے اور ہم تو بخشے بخشائے ہیں۔ اس لئے وہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ: نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط (ہم تو بیٹوں کے مانند اللہ کے چہیتے ہیں) اور وہ اِس پندار میں گرفتار تھے کہ: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط

(اور انہوں نے کہا کہ آگ ہم کو ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن!)

نصاریٰ | عیسائیوں کو شیطان نے اس مغالطے میں مبتلا کیا کہ انسان پیدائشی طور پر

حضرت آدمؑ کے اُس گناہ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے جو انہوں نے جنّت میں اُس درخت کا پھل کھا کر نافرمانی کی صورت میں کیا تھا۔ جس کو کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بصورت انسان بھیجا اور اس کو اس گناہ کے کفارے کے طور پر صلیب پر چڑھوا دیا۔ بس اب جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مان کر اس پر ایمان لائیں گے وہ آسمانی بادشاہت میں داخل کئے جائیں گے۔ اس حیاتِ دُنیوی کا کوئی کبیرہ صغیرہ گناہ اُن کی نجات میں آڑے نہیں آئے گا۔ پھر وہ بھی اسی مغالطے میں مبتلا تھے کہ ہم بھی اللہ کو بیٹوں کے مانند عزیز ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی جس آیت کے ایک ٹکڑے کا میں یہود کے ذکر میں حوالہ دے چکا ہوں وہ یوں ہے کہ : وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔ گویا یہ دونوں گروہ اپنے اپنے انبیاءؑ کو اپنے لئے شفیعِ کُل سمجھتے تھے ——!!

بنی اسمٰعیل | اہلِ عرب جو زیادہ تر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسل پر مشتمل تھے خدا کے منکر نہیں تھے۔ بلکہ وہ خدا کی بنیادی صفات کو بھی مانتے تھے۔ وہ اس کائنات کا خالق خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ رزق دینے والا، زندگی اور موت دینے والا اُسی کو سمجھتے تھے، اس کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ کچھ ایسی باتیں بھی مانتے اور کچھ ایسے کام بھی کرتے تھے جن سے خدا کی صفات اور ان کے مقتضیات سے انکار لازم آتا تھا، جو کفر ہے یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی شرکت لازم آتی تھی جو شرک ہے۔ قرآن مجید میں اُن کے باطل نظریات پر مختلف انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ ان کے مشرکانہ عقیدوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جن معبودانِ باطل کی وہ پرستش کرتے تھے۔ جن کے سامنے وہ مراسمِ عبودیّت بجا لاتے تھے تو وہ ان کو اللہ کے ہاں اپنے لیے سفارشی اور شفیع سمجھتے تھے —— ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے یہ معبود اللہ کے ہاں ہماری سفارش کر کے ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں۔ اس باطل عقیدے کا سورۃ الزّمر میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے :

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ	اور جنھوں نے اللہ کے سوا مددگار ٹھیرائے
اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ	ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو محض اس لئے
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (آیت ۳)	پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں۔

اُمّتِ مُسلمہ | بڑے دُکھ کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے صدیوں کے علمی، فکری،

علمی اور سیاسی انحطاط اور دوسرے مذاہب کے ذہنی و فکری غلبے اور دین (بالخصوص قرآن مجید اور حدیث شریف) سے لاعلمی اور عدم واقفیت کے سبب سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت بھی اس مغالطہ اور "خوش فہمی" اور ناعاقبت اندیشی میں مبتلا ہوگئی کہ جب ہم اُمّتِ مسلمہ اور دامنِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہیں تو حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہماری للّٰہ شفاعت فرمائیں گے، اور ہم نارِ جہنّم کے عذاب سے بچا لیے جائیں گے۔ اس طرح اس باطل عقیدے کی وجہ سے ہماری یہود و نصاریٰ سے ایک مماثلت و مشابہت پیدا ہوگئی اور ہماری عظیم اکثریت اسی باطل نظریے اور عقیدے کی وجہ سے فرائضِ دینی سے غافل، اعمالِ صالحہ اور اسلامی اخلاق سے عاری اور معاملات میں خالص نیا پرستی اہوا پرستی اور مال و منال کی اندھی محبت میں گرفتار ہوگئی ـــــ قانونی طور پر سب مسلمان لیکن عملی طور پر ان میں وہ سب اقسام انتہائی گھناؤنی شکل میں موجود، جو کفّار و فجّار اور مشرکین میں پائی جاتی ہیں ـــ اُن کے نزدیک دین ایک DOGMA سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوجانا ہی اُن کے نزدیک شفاعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام اور نجاتِ اُخروی کے لیے کافی ہے۔ چاہے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے یہ کتنی ہی مشرکانہ اور مبتدعانہ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ قول و عمل کا تضاد اور یہ کفرانِ نعمت نتیجہ ہے اس عقیدے کا جس کو میں نے شفاعتِ مطلقہ اور شفاعتِ باطلہ سے تعبیر کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ قدرت و مشیّت اور عدل میں قطعاً شرک ہے۔

رہی باقی امّت، تو اُس میں بھی اکثر کا حال یہ ہے کہ اُن کا مبلغِ علم بس چند فقہی مسائل تک محدود ہے اور وہ اگرچہ فرائض کی پابندی بھی کرتے ہیں لیکن معاملات، اخلاقیات اور اُن کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے بہت سے بلکہ بے شمار گوشے دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں ـــ دراصل اس تل کی اوٹ میں بھی اسی شفاعتِ باطلہ کا پہاڑ اوجھل ہے!

بہت ہی قلیل تعداد ہوگی، اُن خوش بختوں اور سعید لوگوں کی کہ جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میری اُمّت میں تا قیامِ قیامت ایک ایسا گروہ موجود رہے گا جو حق پر قائم رہے گا اور حق کا داعی ہوگا" (او کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم!)

اغیار کی طنز و تعریض | واقعی جس صورتِ حال کا میں نے بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کو دیکھ کر ہی تو عہدِ حاضر کے عظیم مغربی مفکّر آنجہانی جارج برنارڈ شا نے کہا

تھا کہ "میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی مسائل کے حل کے لیے دنیا میں اِس سے بہتر کوئی کتاب نہیں اور جب مسلمان قوم کو دیکھتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اس سے زیادہ پست اخلاق اور ذلیل و خوار قوم اور کوئی نہیں۔"

نبی اکرمؐ کا عمل نسل اور دین کے قانونی تعلق کی بنیاد پر شفاعت و نجات کے غلط نظریہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب سے تردید فرمائی ہے۔ ان تعلیمات میں خصوصیت کے ساتھ وہ خطبہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے جو حضورؐ نے اپنے اہلِ خاندان کو جمع کر کے ارشاد فرمایا تھا۔ رشتہ داری کے لحاظ سے جو لوگ قریب ترین تعلق کے حامل ہو سکتے ہیں، اُن میں سے دو کو بطور نمائندہ نام بنام مخاطب کر کے فرمایا کہ:

يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا أَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللهِ شَيْئًا يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُولِ اللهِ أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا أَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللهِ شَيْئًا	اے فاطمہ! محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لختِ جگر، اپنے آپ کو اللہ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو اِس لیے کہ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اور اے صفیہ!! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی اپنے آپ کو اللہ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو کیونکہ میں اللہ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لرزا دینے والا ہے۔ غور کیجئے کہ جب نبی اکرمؐ اپنی نورِ چشم اور اپنی پھوپھی رضی اللہ عنہما کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کے لیے مجبوری اور معذرت فرما رہے ہیں تو ہما شما کس شمار و قطار میں آئیں گے!!

شفاعت اور نصوصِ قرآنی قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر واضح طور پر عدالتِ اُخروی میں عدل و انصاف کے لئے قواعد و ضوابط بیان فرما دیئے گئے ہیں۔

اِن میں سے پہلا ضابطہ تو کھلے کھلے کفّار اور مشرکین کے لیے مقرّر ہے، جن میں سے چند کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں جو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے بیان فرمایا گیا تھا۔ اب چند اور سن لیجئے۔ سورۃ الشعراء میں فرمایا کہ جب "غَاوِين" (راہِ حق سے بھٹکے ہوئے یعنی مشرکین و کفّار) کے لیے جہنم کھول دی جائے گی اور وہ اُس میں اُوندھے مُنہ جھونکے جائیں گے تو وہ اپنے ان لیڈروں اور معبودانِ باطل سے، جن کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے، باہم جھگڑا کرتے ہوئے کہیں گے:-

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَمَا اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ (آیت ۹۷ تا ۱۰۱)

خدا کی قسم! ہم کھلی گمراہی میں تھے جب ہم تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا، تو اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ دلی دوست!

سُورۃ المدّثر میں فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ (آیت ۴۸):-

(پس (آخرت میں) شفاعت کرنے والوں کی کوئی شفاعت اُن (مشرکین وکُفّار) کو کوئی فائدہ نہیں دے گی!)

○ سُورۂ اعراف میں مشرکین وکُفّار کا وہ قول نقل ہوا ہے جو وہ آخرت میں انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ اور پشیمانی کے طور پر کہیں گے کہ: فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَآ (پس کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہماری سفارش کریں؟)

○ پوری نوعِ انسانی کے لیے جن میں مشرک، کافر، منافق، مومن سب ہی شامل ہیں۔ عدالتِ اُخروی میں عدل وانصاف کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں جو ضابطے بیان فرمائے ہیں اُن میں سے بھی چند کا ذکر مفید مطلب ہوگا۔

○ سورۂ بقرہ میں آیت ۱۳۴ میں اس ضابطے کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ (یعنی سابقہ امتیں جو گزر چکیں" اُن کو ملے گا جو کچھ اُنہوں نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا!) اِسی سورۂ مبارکہ میں آخری آیت ۲۸۶ کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ: (اللہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا!)

○ آخرت میں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اور نفسی نفسی کا عالم طاری ہوگا۔ کسی کا بوجھ اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ النجم میں فرمایا:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ

اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے۔ اور یہ کہ اُس کی

يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (آیات ۳۹ تا ۴۱) — سعی عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اُس کی پوری جزا اُسے دیدی جائے گی۔

یہ مضمون کہ: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ صیغوں کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ الانعام میں بھی، سورۂ بنی اسرائیل، سورۃ الفاطر اور سورۃ الزمر میں بھی۔

شفاعتِ حقہ | جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا کہ شفاعتِ حقہ کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے اور شفاعتِ حقہ کا عقیدہ و نظریہ عین حق بلکہ جزوِ ایمان ہے۔ لیکن یہ شفاعت چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جس کا میں قدرے تفصیل سے آگے ذکر کروں گا۔ اس سے قبل میں چاہتا ہوں کہ حکمتِ شفاعت کی کچھ وضاحت کر دوں۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ علّام الغیوب ہے، وہ علیم ہے اور علیم بھی کیسا علیم، کہ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ اور وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ کی شان کا حامل۔ اُس کی عدالتِ اُخروی میں حضرت آدمؑ سے لے کر تا قیامِ قیامت جتنے بھی انسان پیدا کئے گئے تھے۔ وہ سب کے سب حسابِ کتاب کے لیے اپنے اپنے اعمال ناموں کے ساتھ حاضر ہوں گے اللہ عزّ وجلّ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ کون کیا کما کر لایا ہے۔ کون سزا کا مستوجب ہے اور کون جزا کا استحقاق رکھتا ہے اور کون ہے جو رعایت اور رحم و کرم کا مستحق ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر باغیوں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، کافروں اور مشرکوں کو نارِ جہنّم میں جھونکنے اور فرماں برداروں کو نیکوکاروں کو، مومنین صادقین و قانتین کو جنّت کے باغات میں داخل ہونے کا حکم صادر فرمادیں اور جو رعایت کے مستحق ہیں ان کو چاہیں تو اپنی شانِ رحیمی اور شانِ غفّاریّت کے طفیل بخش دیں اور چاہیں تو اپنی شانِ قہاریّت اور شانِ عنیوریّت کا مظاہرہ فرمائیں اور اُن کو بھی سزا کا سزاوار ٹھہرا دیں۔ چاہیں تو سب کو بلا حساب و کتاب معاف فرمادیں اور سب کو خُلودِ جنّت سے سرفراز فرمائیں اور چاہیں تو سب کو نارِ جہنّم کا ایندھن بنانے کا فیصلہ صادر فرمادیں۔ چونکہ اُن کی تو شان ہی یہ ہے کہ: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط اختیارِ مطلق کی جس پر کوئی تحدید نہ ہو اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط کی اطلاقی شان کا مقتضیٰ یہی ہے THE ABSOLUTE SOVEREIGNTY اسی طرزِ عمل کا نام ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ——

اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ط اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ط سے یہی اطلاقی و مطلق شان مراد ہے۔ وہ ربّ العٰلمین ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ العزیز الجبّار المتکبّر ہے وہ اپنے بندوں، اپنے غلاموں اور اپنی مخلوق کے ساتھ جو چاہے معاملہ کرے۔ یہی بات ہے جو آخرت میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں گے: اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ط (سورۂ مائدہ آیت ۱۱۸) لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ اس آیتِ کریمہ میں اس کی صفت العزیز کے ساتھ ساتھ صفتِ الحکیم بھی بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر العزیز الحکیم کی صفات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ یعنی وہ تعجہاں العزیز (زبردست و غالب) ہے وہاں وہ الحکیم بھی ہے اور اُس کی حکمت ہی کے مقتضیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلے صادر فرمانے کے بجائے ہر انسان کے اعمال و افعال نیتوں اور ارادوں کا محاسبہ فرمائے، اس پر شہادتیں گزارے، اس کو صفائی کا پورا موقعہ عنایت فرمائے، ان پر قطع عذر فرمائے۔ وہ العادل، المنصف، الرؤف الرحیم بھی ہے۔ لہٰذا ان صفات کا آخرت میں بھرپور ظہور ہوگا۔ عدل و انصاف اس کی شانِ رافت و رحیمیت کے لوازم میں سے ہیں۔ اس کے لیے بطورِ دلیل سورۂ قلم کی یہ آیات کافی ہیں۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۝ (آیت ۳۵-۳۶)	کیا ہم فرماں برداروں کا حال (انجام کار کے لحاظ سے) مجرموں جیسا کر دیں گے؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے (ناروا) حکم لگاتے ہو؟

شفاعتِ حقّہ کے شرائط و لوازم | شفاعت دراصل ایک اعزاز و اکرام ہے جس سے وہ اپنے اُن محبوب بندوں کو سرفراز فرمائے گا جو منعم علیہم کے زمرے میں شامل ہوں گے۔ یعنی انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین ——— اور اس طائفہ کے سرخیل و سردار ہیں شافعِ محشر جناب محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ اللہ کے ان محبوب عبادالرّحمٰن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ جس کے حق میں جی چاہے سفارش کریں گے خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ تو یہ عقیدہ اور نظریہ نہ صرف ان عبادالرّحمٰن کا سوءِ ادب ہے بلکہ اُن کی شان میں گستاخی ہے۔ لہٰذا ایسی بے سروپا سفارش کا احکم الحاکمین

کی عدالت میں پیش کرنے کا عقیدہ و تصوّر سراسر ضلالت و گمراہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شفاعت ردّ کر دی جائے گی اور یہ استدراد ان عباد الرحمٰن کی سبکی بلکہ اہانت کا باعث ہوگا۔ جبکہ میں نے عرض کیا کہ شفاعت تو دراصل اعزاز و اکرام ہے، مقامِ شرف و عزّت ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں شفاعت کا ذکر فرمایا ہے وہاں بِاِذْنِ اللّٰہ اور لِمَنِ ارْتَضٰی کی شرط لگا دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل اور علمِ قدیم میں جو لوگ رعایت کے مستحق ہیں اور جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ معاف فرمانے کا فیصلہ پہلے ہی فرما چکا ہے ان فیصلوں کے اعلان (DECLARATION AND ANNOUNCEMENT) سے قبل اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ نیکوکار، محبوب بندوں (انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین) کو شفاعت کی اجازت دیں گے اور وہ شفاعت قبول کی جائے گی۔ نیز پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شفاعتِ کبریٰ سے سرفراز فرمایا جائے گا کہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنّم میں سزا بھگت رہے ہیں، اُن میں جن لوگوں کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہے ان کو شافعِ محشرؐ کی شفاعت پر جہنّم سے نجات ملے گی اور پھر جہنّم ہمیش ہمیش کے لیے بند کر دی جائے گی جیسا کہ خبرِ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے لیکن یاد رکھئے کہ جہنّم وہ جگہ ہے جس کے لیے سورۃ الفرقان میں فرمایا کہ: اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ط جہنّم مستقل جائے قرار اور عارضی قیام دونوں اعتبارات سے بہت برا ٹھکانا ہے۔" اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ط

اس مقدّمے کے ساتھ سب سے پہلے تو اس شفاعت کا ذکر سُنئے جو آیت الکرسی میں وارد ہوئی ہے، جس آیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تمام آیات کا سرتاج قرار دیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ و عظیمہ کے درمیان میں شفاعت کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا
مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ	ملک ہے (جو اللہ الحیّ القیوم ہے) کون ہے
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ	اُس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر کسی کی
اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج	شفاعت (سفارش) کر سکے؟ وہ جانتا ہے

(آیت ۲۵۵) جو کچھ اُن کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔

اس آیت میں جو استثنائی اِلَّا آیا ہے وہ قیامت کا اِلَّا ہے کہ اس استثناء نے توحید اور ایمان اور اعمالِ صالح وحسنات کو شرک وکفر اور بدعملی وسیئات سے بالکل ممیّز کر دیا اور اس خام خیالی کی تردید کر دی کہ اللہ کی عدالت میں کوئی بھی اپنے مقام و مرتبہ، اپنی حیثیت، اپنی قوّت، اپنی وجاہت اور اپنی مشیئت (ارادے)، کسی بھی اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلوا سکے۔ اس مضمون ومفہوم کو سُورۃ الانبیاء میں یوں بیان فرمایا :

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ٥ (آیت ۲۸)

وہ (اللہ) ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے، سب سے باخبر ہے اور شفاعت نہیں کریں گے مگر اُس (اللہ) سے ڈرتے ہوئے صرف اُس کے لیے جس کے لیے وہ (اللہ) پسند فرمائے !

اس آیت کے سیاق میں اہلِ کتاب اور بنی اسمٰعیل کے شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ سے پہلے بھی جو رسول آئے اُن کی طرف یہی وحی کی جاتی رہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس صرف میری ہی بندگی کرو —— اہلِ کتاب اور مشرکینِ مکّہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی اولاد ہے انہوں نے خدا کے رسولوں اور نبیوں کو اللہ کی اولاد قرار دے دیا ہے۔ اللہ ان باتوں سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ بلکہ سارے انبیاء ورسل خدا کے مقرّب بندے ہیں۔ وہ اُس کی عدالت میں بات میں پہل نہیں کرتے، وہ بس اُس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں " وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ٥ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ٥ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ٥ (آیات ۲۵، ۲۶، ۲۷)

اُس کے بعد وہ اٹھائیسویں آیت ہے جس میں شفاعت کا یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ شفاعت صرف اُس کی اجازت اور مرضی سے ہو گی اور اُن ہی کے حق میں ہو گی جن کے

حق میں وہ شفاعت قبول فرمانے کا پہلے ہی فیصلہ فرما چکا ہوگا۔

شفاعت کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کا ذکر۔۔۔!!

آیت الکرسی اور سورۂ انبیاء میں شفاعت کے ذکر کے بعد اور پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ کامل کا جو ذکر فرمایا کہ: یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ۔ تو اُس کی حکمت بھی سمجھ لیجئے۔ خدا کا علم کامل ہے اور ہر غلطی سے مُنزّہ ہے۔ اُس کی جناب میں کسی کو از خود سفارش کیلئے زبان کھولنے کی جسارت کا مطلب تو یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ اس شخص کے بارے میں خدا کو پوری آگاہی نہیں ہے اور وہ اپنی سفارش سے اُس کی معلومات میں اضافہ یا اُس کی معلومات کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ وہ ماضی و مستقبل کے پورے حالات سے باخبر ہے۔ وہ اللطیف الخبیر ہے۔ چنانچہ سُورۂ طٰہٰ میں بھی اس بات کو واضح کیا کہ علمِ الٰہی کی وسعتوں کا کیا ٹھکانا ماسوا کا علم محض عطائی ہی نہیں بلکہ محدود بھی ہے۔

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوۡلًا۝ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِهٖ عِلۡمًا۝ (طٰہٰ آیات ۱۰۹-۱۱۰)	اس (قیامت کے) دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہ پہنچائے گی۔ مگر جس کے لیے خدائے رحمٰن اجازت دے اور اُس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے، وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے اور ان کے آگے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

شفاعت کے لیے اِذن اور رضائے باری تعالیٰ کی شرائط سے متعلق میں چاہتا ہوں کہ چند آیات مزید پیش کردوں تاکہ مسئلہ مزید واضح ہو جائے۔

وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ ط (سورہ سباء (آیت ۲۳))	اور اللہ کی عدالت میں کوئی شفاعت بھی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ سوائے اُس شخص کے حق میں جس کیلئے اللہ نے شفاعت کی اجازت دی ہو۔

سورۂ نجم کی آیت کا پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں ایک بار پھر اُس کو سن لیجئے، فرمایا:۔

وَکَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَیۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَرۡضٰی	اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی۔ جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اجازت نہ دے

(بقیہ صد ۱۸ پر)

قندِ مکرّر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک تحریر

جو 'میثاق' بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی :

مولانا ابوالکلام آزاد — جمعیت علماء ہند

اور

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ

'میثاق' بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۷۱ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں جو ایک طویل تحریر راقم الحروف کے قلم سے شائع ہوئی تھی اُس میں اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے جائزے کے سلسلے میں جو اس وقت پورے عالم اسلام میں جاری ہے، قومی تحریکوں کے ذریعے حصول آزادی اور علمائے کرام کے دفاعی رول کے ذکر کے بعد عرض کیا گیا تھا:

"اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرِ کار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن ؎ ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم" اور "ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدّھم" کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدّت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی لیکن واقعہ

یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسسِ اوّلین اور داعی اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے "حکومت الٰہیہ" کے قیام اور اس کے لئے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے خصوصاً تحریک خلافت کے دوران ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع "دوائے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!" مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ "ہم بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔" اور ایک خیال جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں[1] اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبہ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ

---

[1] 'الہلال' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

پیش ہے اُس میں "شیخ الہند" سے بھی بڑھ کر "امام الہند" کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور
کے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔
ن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے
د انہوں نے براہ راست مولانا آزاد کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ
ایاز قدرِ خود بشناس!" جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہو
۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور دل برداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش
گئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی!"

اس پر ہمیں محترم احمد حسین کمال صاحب؎ کا درج ذیل مکتوب ملا، جس کا آغاز تو نہایت

؎ ڈاکٹر کمال صاحب سے غائبانہ تعارف تو راقم الحروف کو کچھ پہلے سے بھی حاصل تھا۔ لیکن بالمشافہ ملاقات ان
سے ۷۰، ۱۹۶۹ء میں ہوئی جبکہ پاکستان کی سیاسی فضا میں بڑی گرما گرمی تھی اور دائیں اور بائیں بازو کے
درمیان کچھ کاغذی اور کچھ ہوائی جنگ بڑے زور شور کے ساتھ جاری تھی۔ جس میں دوسرے بہت سے
"متقابلین" کے شانہ بشانہ جماعتِ اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے مابین بھی معرکہ آرائی
چل رہی تھی ـــ موصوف اس زمانے میں جمعیت کے ہفت روزہ آرگن "ترجمان اسلام" کے مدیر تھے ـــ
اور غالباً جمعیت کے پالیسی بنانے والے حلقوں میں بھی خاصے دخیل تھے۔ بہرحال ان سے مل کر اندازہ
ہوا کہ مذہب سے تو ان کا تعلق کچھ واجبی اور روایتی سا ہی ہے البتہ وہ ایک منجھے ہوئے سیاسی کارکن
اور پختہ سوشلسٹ ورکر ہیں۔ بعد میں وہ کراچی منتقل ہو گئے اور "جمعیت اکادمی" کے نام سے کچھ کتابیں بھی
انہوں نے شائع کیں جن میں سے ایک مولانا آزاد مرحوم کی سیاسی بصیرت سے متعلق بھی تھی۔ راقم کا
خیال تھا کہ یہ اکادمی جمعیت علماء اسلام ہی کا کوئی ذیلی ادارہ ہے لیکن پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو بڑی
تلاش و جستجو سے راقم کورنگی کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اگرچہ ملاقات کا شرف
تو حاصل نہ ہو سکا تاہم یہ معلوم کر کے کچھ حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر دکھ بھی ہوا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے
پسرِ کلاں بھی روسی سفارت خانے کے کسی ذیلی ادارے میں ملازم ہیں ـــ اگرچہ ساتھ ہی یہ خیال
بھی آیا کہ ؎ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری اس
"حق گوئی" کا بُرا نہ منائیں گے!

مشفقانہ ہے لیکن اختتام اُسی قدر متحدیانہ (CHALLENGING) ہے :-

"مکرم و محترم، ڈاکٹر اسرار احمدؒ صاحب، سلام و رحمۃ

آپ کا موقر ماہنامہ "میثاق" گاہے بگاہے موصول ہوتا رہتا ہے۔ میں اس کے لئے آپ کا نہایت ممنون ہوں۔

میں ہمیشہ آپ کے مضامین بغور پڑھتا ہوں اور آپ کے دینی جذبہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔

تاہم آپ کے افکار اور آپ کا طریق تنظیم، ابتدائی دور کی، جماعت اسلامی، اور مودودی صاحب کے انداز کا سا ہے اور اس کے نتائج و مراحل کے بارے میں بہت سے اندیشے سامنے آجاتے ہیں۔

لیکن فی الحال میرا ارادہ اس سلسلے میں کسی تبصرہ اور تنقید کا نہیں ہے۔ بلکہ اس عریضہ کا مقصد آپ کی توجہ، آپکی ایک حالیہ تحریر کی طرف مبذول کرانا ہے۔ جو ماہنامہ "میثاق" نومبر ۱۹۷۱ء میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

آپ کے اس طویل مقالہ کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جو قابل گفتگو ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف ایک مقام کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ جو "میثاق" کے اس پرچہ کے صفحہ ۳۹ پر ہے اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے متعلق ہے۔

آپ نے محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے حوالہ سے جو واقعہ جمعیۃ علماء اسلام کے اجلاس منعقدہ، دہلی، اپریل ۱۹۲۲ء کے بارے میں لکھا ہے میں اس کے بارے میں، عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ ایک تاریخی واقعہ کی تصحیح فرمالیں۔

جمعیۃ علماء ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔

پہلا اجلاس، امرتسر میں ہوا، اور پہلے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی منتخب ہوئے۔

دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ہوا، اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اس کے صدر تھے۔

تیسرا اجلاس ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقد ہوا، مولانا ابوالکلام آزادؒ اس کے صدر تھے۔

اس سال اپریل میں مولانا آزاد گرفتار کر لیے گئے۔

قولِ فیصل کے نام سے ان کا مشہور تاریخی بیان اس گرفتاری کے بعد ہی علی پور کلکتہ کی جیل میں عدالت کے سامنے دیا گیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۲۲ء میں، مولانا، جیل میں تھے، دوسرے یہ کہ ۱۹۲۲ء کے جمعیۃ علماء اسلام کا اجلاس، دہلی میں نہیں، گیا، صوبہ بہار میں منعقد ہوا تھا۔ اور مولانا آزاد کی گرفتاری پر، احتجاج کا ریزولیشن پاس کیا گیا تھا۔ نیز مولانا کو مبارک باد کا تار بھی بھیجا گیا تھا۔

اس اجلاس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی نے کی اور اس سال کے جمعیۃ علماء اسلام کے صدر بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ اس تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا آزادؒ اور مولانا معین الدین اجمیری سے منسوب "میثاق" میں ذکر کردہ اس واقعہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

مجھے عرض کرنا پڑتا ہے کہ، مولانا آزاد کے معاملہ میں بعض حلقوں کے احساس کمتری نے بہت سے، خانہ ساز جھوٹ تراشے ہیں، یہ بھی منجملہ ان کے ایک ہے۔

۱۹۲۲ء میں نہ تو جمعیۃ علماء اسلام کا اجلاس دہلی میں ہوا، نہ مولانا اس سال قید فرنگ سے آزاد تھے

پھر بھلا اس سارے افسانہ کی کیا حقیقت ہے۔ پتہ نہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب تک یہ روایت کن صاحب نے پہنچائی۔

کانگریس میں حضرت مولانا آزاد کی شمولیت کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کے دینی اور سیاسی پروگرام کا ایک جز تھی۔ اس موضوع پر میں تفصیل سے روشنی ڈال سکتا ہوں۔ مگر ابھی صرف اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اگر آپ کی حق پسندی اجازت دے تو "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں، ان سطور کو شائع فرما دیجئے۔

بہرحال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ والسلام کمالی

اس خط کی وصولی پر راقم نے سب سے پہلے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مضمون میں روایت کے ساتھ راوی کا نام بھی درج کر دیا گیا تھا۔ اور وہ بفضلہٖ تعالےٰ ابھی بقیدِ حیات ہیں پھر جب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سفر کراچی سے واپس آئے تو معاملہ ان کے سامنے رکھ دیا لیکن انہوں نے صرف یہ مزید وضاحت کر کے کہ مجھے یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم کے برادر بزرگ مولانا عبدالماجد بدایونی نے سنایا تھا اور وہ اس اجتماع میں بنفسِ نفیس موجود تھے کہہ کر جان چھڑالی کہ "ہو سکتا ہے کہ سن کے بارے میں میری یادداشت نے غلطی کی ہو، بہرحال میرے پاس ان باتوں کی تحقیق و تفتیش کے لئے وقت نہیں ہے!"

چشتی صاحب تو یہ کہہ کر فارغ ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ غور شروع ہوا کہ اس سلسلے میں کس سے رجوع کیا جائے۔ اوّلاً ذہن مولانا سید حامد میاں صاحب کی جانب منتقل ہوا کہ وہ مولانا محمد میاں صاحب کے فرزند ارجمند ہیں جمعیتِ علماء ہند کی اہم شخصیتوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا گیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس پورے معاملے سے بالکل بے خبر ہیں۔

اچانک ذہن جماعتِ اسلامی کے بزرگ رکن اور مشہور صحافی ملک نصراللہ خاں عزیز کی طرف منتقل ہوا۔ موصوف کے بارے میں کبھی یہ بات سننے میں آئی تھی کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی[1]۔ موصوف اب بہت ضعیف بھی ہیں اور بالکل گوشہ گیر بھی، ان سے ان کے فرزند اکبر ملک ظفراللہ خان صاحب کی وساطت سے رابطہ قائم کیا جن سے راقم کو اسلامی جمعیتِ طلبہ کے زمانے سے نیاز حاصل ہے، تو کچھ اُمید افزا صورت نظر آئی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دے کر معلومات حاصل کیں

---

[1] ملک صاحب نے نہ صرف اس کی توثیق فرمائی بلکہ یہ بھی بتایا کہ ۱۹۳۰ء میں وہ گونڈہ جیل میں مولانا آزاد کے ساتھ ہی نظر بند تھے۔ اور وہیں ترجمان القرآن، کی جلد اوّل کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں اشتراکِ عمل طے پایا تھا۔ ملک صاحب نے مزید بتایا کہ بعد میں جب جماعتِ اسلامی قائم ہوئی اور ملک صاحب اس میں شامل ہو گئے تو ڈاکٹر نذیر احمدؒ الٰہ آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جماعت کا لٹریچر پہنچایا اور ملک صاحب نے بھی اس سلسلے میں ان سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: "کام تو درست ہے۔ لیکن میں مودودی صاحب کی صلاحیت اور استعداد سے واقف نہیں ہوں۔ مزید برآں اگر میں جماعت میں شامل ہوں تو ظاہر ہے کہ پھر پروگرام

ملک صاحب نے فرمایا:

"۱۹۴۱ء میں جمعیت علماء ہند کا جو اجلاس بریڈلا ہال لاہور میں ہوا تھا[1] اس موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر بیعت کی جائے گی۔ لیکن بعد میں کچھ نہ ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ اندرون خانہ دیوبندی علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور غیر دیوبندی علماء میں سے مولانا معین الدین اجمیری نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی تھی!"

مزید برآں، ملک صاحب نے اس کی بھی توثیق فرمائی کہ مولانا عبدالماجد بدایونی بھی اس اجلاس میں موجود تھے!

اس سے اصولی طور پر تو چشتی صاحب کی روایت کی تصدیق ہو گئی تاہم ابھی مزید تحقیق کا خیال تحت الشعور میں موجود تھا کہ ایک خاص ضرورت سے کراچی میں مولانا منتخب الحق قادری[2] کی خدمت میں حاضری کا موقع ہوا تو اچانک ذہن ادھر منتقل ہوا کہ مولانا موصوف کو مولانا معین الدین اجمیریؒ کے تلمیذ رشید کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اُن سے بھی معاملہ زیر بحث کے متعلق استفسار کر دیا گیا۔ جواباً مولانا نے باقاعدہ املا کرایا کہ:

"مولانا معین الدین اجمیری نے بغیر تاریخ اور سن کے ذکر کے تذکرہ فرمایا کہ کسی کو امام الہند ماننے کی تجویز زیر غور تھی۔ اس کے لئے پہلے سے خط و کتابت بھی چل رہی تھی، بعد ازاں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں تمام علماء ہند جمع ہوئے اور اس موضوع پر نہایت زور دار تقریریں ہوئیں اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا مولانا آزاد کی تقریر گویا حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی جس سے تمام حاضرین مسحور سے ہو گئے اور یہ آوازیں بھی بلند

---

[1] جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس کا ذکر ڈاکٹر شیر بہادر پنی کی ایک حالیہ تالیف افاداتِ مہر میں دو طرح آیا ہے: (دیکھئے چوکھٹہ برصفحہ)

[2] مولانا کراچی یونیورسٹی میں ڈین آف دی فیکلٹی آف تھیالوجی ہیں راقم کو ۶۴-۱۹۶۳ء میں ایم اے اسلامیات کی تعلیم کے سلسلے میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا۔ ان کی خدمت میں مذکورہ حاضری دوسری سلائی قرآن کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی تھی!

ہوئیں کہ ہاتھ بڑھائیے ہم آپکے ہاتھ بیعت کرتے ہیں! اس پر میں نے صدرِ جلسہ سے صرف پانچ منٹ کچھ کہنے کے لئے مانگے جو بہت مشکل سے اس شرط کے ساتھ ملے کہ چھٹا منٹ کسی صورت نہ ہونے پائے۔ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ علماء کے اس موقر اجتماع میں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف اشارہ کافی ہے۔ میں جملہ علماء کی توجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو آپؓ نے حج سے واپسی پر اس قسم کا چرچا سن کر کی تھی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو ہم فوراً اور دفعتہً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمانؓ ابن عوف کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کریں اور پھر فرمایا کہ "فَلْتَةً بیعۃ[1]" امت کے حق میں کبھی مفید نہیں ہوگی۔ اگر لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے استدلال کریں گے تو بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کریں گے اس لئے کہ حضرت ابوبکر واحد شخصیت ہیں جن کے لئے اس قسم کی بیعت خالی از مضرت تھی۔ ان رضؓ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں ہے!۔ میرے اس توجہ دلانے پر جلسے کا رنگ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ میری تائید میں مولانا انور شاہ؟ صاحب نے ایک نہایت غامض اور دقیق تقریر فرمائی اور مولوی شبیر احمد عثمانی نے بھی میری تائید کی اگرچہ اس سے پہلے وہ اصل تجویز کی تائید میں تقریر کر چکے تھے!"

مزید برآں مولانا منتخب الحق صاحب قادری نے یہ بھی فرمایا کہ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولانا نے اس اجلاس کی صدارت کے ضمن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا ذکر فرمایا تھا!" ——— اور یہ بھی فرمایا کہ "میں نے اس موضوع پر ایک خط کی نقل نصیر میاں[2] کے پاس دیکھی ہے جو مولانا نے عبدالباری فرنگی محلی کے نام تحریر فرمایا تھا!"

گویا راقم کے سمندِ شوق کو ایک اور ایڑ لگ گئی، چنانچہ کشاں کشاں حکیم نصیرالدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے متذکرہ بالا خط کی فوٹو سٹیٹ کاپی حاصل کی جس کی عبارت

---

[2] حکیم نصیرالدین صاحب مالک نظامی دواخانہ، صدر کراچی فرزند مولانا حکیم نظام الدین مرحوم برادر خورد مولانا معین الدین اجمیریؒ۔

[1] یعنی کسی ہنگامی اور جذباتی فضا میں دفعتہً اور اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینا۔

درج ذیل ہے :

"از دارالخیر ، اجمیر

۱۲ ستمبر ۲۱ء

مرجع انام حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

والا نامہ نے عزت بخشی ، سابق والا نامہ چونکہ جواب طلب نہ تھا اس وجہ سے تاریخ مقررۂ آنمخدوم کو ذہن میں رکھ کر عریضہ حاضر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ۵ محرم الحرام کے بعد حاضر خدمت ہو کر آنمخدوم کی ہمرکابی میں پنجاب روانہ ہو جاؤنگا ۔ یہی ارادہ اب بھی ہے ۔ اطلاعاً عرض کیا گیا ــــ لیکن دہلی کے جلسۂ جمعیۃ العلماء کی شرکت نے اس سفر میں ایک جدید مانع پیش کر دیا کیونکہ اس کی تجویز کے مطابق ۱۷ و ۱۸ ستمبر کو جلسۂ منتظمہ قرار پایا ہے ۔ اس میں ضبطیٔ فتویٰ و مسئلۂ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بیحد رجحان ہے ۔ چونکہ ان کو اس مسئلہ سے زیادہ دلچسپی ہے اس وجہ سے خالی الذہن علماء ان کی تقریر سے متاثر ہوئے اگر منجانب فقیر اس کے التواء کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلہ کو طے کر دیتے ۔ اس وجہ سے علماء دہلی کا یہ خیال ہے کہ فقیر خصوصیت کے ساتھ اس جلسہ میں شریک ہو ۔ ادھر جناب مولوی شوکت علی صاحب نزاع رنگون کے متعلق زور دے رہے ہیں کہ فقیر جلسہ سے جلد وہاں پہنچکر ان نزاعات کا تصفیہ کرائے جن کی وجہ سے وہاں کی کمیٹی خلافت کا وجود خطرہ میں ہے ۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں جاؤں اور کس سفر کو پہلے اختیار کروں ۔ اس کے متعلق امروز و فردا میں آنمخدوم کی خدمت میں عریضہ حاضر کرنے والا تھا کہ دفعتہً والا نامہ نے شرف بخشا ۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں عرض حال کر دیا جائے ۔ جو آنمخدوم کی رائے ہوگی اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے بالکل تیار ہوں ۔ فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہٗ "

مندرجہ بالا شواہد اور قرائن کی بنا پر نفس مسئلہ تو بالکل طے ہو گیا یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے امام الہند کے خطاب اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور پھر اس کے ناکام رہ جانے میں مولانا معین الدین اجمیری کا خصوصی حصہ تو بلاشائبہ ریب و شک ثابت ہو گیا۔ البتہ مختلف روائتوں کی جمع و تطبیق اور کچھ دوسرے قرائن و شواہد کی روشنی میں جو صورت سامنے آتی ہے وہ غالباً کچھ یوں ہے :۔

۱۔ یہ مسئلہ سب سے پہلے جمعیت العلماء ہند کے اُس دوسرے اجلاس میں زیر بحث آیا جو دہلی میں ۷ تا ۹ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۰ء) حضرت شیخ الہندؒ کے زیر صدارت منعقد ہوا اور جس کے تقریباً دس ہی دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اور اُسی موقع کی روداد ہے جو مولانا معین الدین اجمیریؒ نے مولانا منتخب الحق صاحب کو سُنائی اور انہوں نے راقم کو املا کرائی۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذات زیر بحث نہیں آئی تھی بلکہ صرف اِس اصولی اعتراض پر کہ ایسے اہم معاملے پر فیصلہ اچانک نہیں کر لیا جانا چاہئے تجویز زیر غور پر فیصلہ ملتوی کیا گیا تھا تاکہ مزید مشورہ بھی ہو سکے اور سوچ بچار بھی!

۲۔ فطری طور پر اس کے بعد یہ معاملہ بحث و تمحیص اور خط و کتابت کا موضوع بنا رہا ہوگا تا آنکہ جمعیت کا وہ تیسرا اجلاس سر پر آ پہنچا جو لاہور میں نومبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا۔ چنانچہ بعض دوسرے امور کے علاوہ خاص اس مسئلے پر بھی حتمی فیصلہ کر لینے کے لئے مجلس منتظمہ کا وہ اجتماع ۱۷ یا ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں منعقد ہونا طے پایا جس کا ذکر مولانا معین الدین اجمیریؒ نے اپنے مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء میں کیا ہے ——— اغلباً یہی وہ اجلاس ہے جس میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی روایت مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کی وساطت سے مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو اور ان سے راقم کو پہنچی۔ اور درج "میثاق" ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ موقع تھا جہاں 'امام الہند' کے عظیم و رفیع المنصب کے لئے جس شخص کا نام تجویز کیا جا رہا تھا اس کی ذات لامحالہ زیر بحث آئی اور اس سلسلے میں جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں مولانا معین الدین اجمیری نے کہا ہوگا اس کا کسی قدر اندازہ ان کے اُس ایک جملے ہی سے بخوبی ہو جاتا ہے جو

محولہ بالاخط میں موجود ہے یعنی ''اس میں ضبطیٔ فتویٰ اور مسئلہ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بے حد رجحان ہے''، اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ بحث کی گرما گرمی میں مولانا معین الدین اجمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کو براہ راست خطاب کر کے کہا ہو کہ ''ایاز قدر خود بشناس! ۔ کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب! تم ایسے نوعمر (مولانا آزاد مرحوم کی عمر اس وقت کل ۳۲ برس تھی!) کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں! رہا تمہارا علم و فضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو!'' ـــــ چنانچہ لگ بھگ اسی مفہوم پر مشتمل تھے وہ کلمات جو چشتی صاحب نے نقل فرمائے تھے اور راقم نے جان بوجھ کر حذف کر دیئے تھے ـــــ اور صرف ''ایاز قدر خود بشناس!'' کے الفاظ سے کلام کے رُخ کی جانب اشارہ کرنے پر اکتفا مناسب سمجھا تھا!

۲۔ اس کے دوسوا دو ماہ بعد ہوا بریڈلا ہال لاہور میں جمعیت کا وہ تیسرا اجلاس جس کا ذکر ع ''دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!'' کے سے انداز میں فرمایا ہے ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے، اور جس کی صدارت کے لئے منتظمین نے پیشگی مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اس امید میں طے کر دیا ہوگا کہ مجلس منتظمہ میں یہ تجویز بہر حال منظور ہو ہی جائے گی۔ تو جیسے امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر عمومی بیعت کرنی ہے کیوں نہ یہ اجلاس اسی کی صدارت میں ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجلس منتظمہ کے اجتماع میں تجویز پاس ہونے سے رہ گئی۔ چنانچہ لاہور کا اجلاس خانہ پری کے لئے ہوا تو سہی لیکن کچھ یونہی پھیکے سے انداز میں، یہی وجہ ہے کہ خود مولانا آزاد اس میں اُکھڑے سے رہے جس کا تذکرہ ہے، ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کی بیان کردہ روداد میں! ـــــ اور بالکل مطابقِ قرائن ہے یہ بات کہ یہی ''اُکھڑاہٹ'' تھی جس کے نتیجے کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جمعیۃ العلماء کا پلیٹ فارم ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا اور ع ''کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے'' کے مصداق اپنی جولانیٔ طبع کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کا وسیع و عریض میدان منتخب کر لیا۔

اب اگر تو ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب ان تفاصیل سے بے خبر ہیں اور اسی بنا پر

انہوں نے اس روایت کی تردید کی ہے تو پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے انہوں نے محض تاریخ اور سن کی ایک معمولی سی غلطی سے فائدہ اٹھا کر اسقدر متحدیانہ انداز میں حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے تو بہت ہی ہلکی رائے ان کے بارے میں قائم کرنی ہوگی۔ گویا ؎

اِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَھٰذَا مُصِیْبَۃٌ
وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

ہماری خواہش بہرحال یہ ہے کہ صورتِ حال پہلی ہی ہو ——— نہ کہ دوسری!

۲

مسئلہ متذکرہ بالا پر تحقیق و تفتیش کے دوران راقم الحروف پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو منکشف ہوئے جن کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔ جہاں تک ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدین، خلوص و للّٰہیت۔ پھر صبر و استقلال، ہمت و عزیمت، اور مجاہدہ و مصابرت، گویا علم اور عمل کی جامعیت کا تعلق ہے اس کا تو کسی قدر اندازہ پہلے بھی تھا لیکن وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری، کے ساتھ ساتھ وسعتِ قلب اور عالی ظرفی کا جو امتزاج اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا اس کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔

مولانا ۱۳۳۳ھ میں ہندوستان سے عازمِ حجاز ہوئے تھے۔ جہاں سے گرفتار ہو کر تقریباً تین سال اور سات ماہ حالتِ اسیری میں رہے ——— اور رہائی ملنے پر ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو واپس بمبئی پہنچے۔ اس کے بعد ان کی زندگی نے کل چھ ماہ کے لگ بھگ وفا کی۔ اور ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے! پھر اس مختصر مدّت کے دوران میں ضعیفی اور عام نقاہت پر مستزاد مرض و علالت کا بھی مسلسل ساتھ رہا۔ بایں ہمہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ دین و مذہب اور ملّت و امّت کے مسائل سے فارغ الذہن ہو سکے نہ ملک و وطن کے معاملات سے! اور اس مختصر مدّت میں جو چند کام انہوں نے کئے یا کرنے

کی کوشش کی ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ موجود الوقت صورتِ حال کا بالکل صحیح تجزیہ کر چکے تھے بلکہ ان کی نگاہیں مستقبل کے حالات و واقعات کا بھی نہایت دور تک مشاہدہ کر رہی تھیں۔ مزید برآں ان کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کے تو وہ شواہد سامنے آتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ع

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!"

اور اس پس منظر میں، ہمیں معاف فرمایا جائے اگر ہم اپنے آپ کو اپنے اس احساس کے اظہار پر مجبور پائیں، کہ اُن کے جانشینوں میں سے مختلف حضرات ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے وارث تو ضرور بنے لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا وارث نہ بن سکا۔ گویا ؎

"نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی!"

اور صورتِ حال بالکل اس شعر کے مصداق ہو گئی کہ ؎

"اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!"

خصوصاً وہ حضرات جو سیاست، یا جہادِ حریت، یا تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ان کے جانشین بنے انہوں نے تو اپنے گرد تقلیدِ جامد کا لبادہ اسقدر کس کر لپیٹا کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو گئی لیکن انہوں نے اپنے موقف میں ترمیم کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اس کے بالکل برعکس کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت میں: مثلاً علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ملتِ اسلامیہ ہند کے بحرِ محیط میں جو دو رو ئیں علی گڑھ اور دیوبند کی صورت میں بالکل مخالف سمت میں بہہ نکلی تھیں اور ان سے جسدِ ملّی کے پارہ پارہ ہونے کا جو شدید خطرہ موجود تھا اس کا بالکل بروقت اور صحیح اندازہ مولانا نے فرما لیا، حالانکہ وہ خود ان میں سے ایک کشتی میں بالفعل سوار تھے اور اس اعتبار سے بالکل خلاف توقع نہ ہوتا اگر خود ان میں یک رخا پن پیدا ہو جاتا یا کم از کم فریقِ ثانی کے لئے کوئی نرم گوشہ دل میں موجود نہ رہتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھ ماہ سے بھی کم مدت میں انہوں نے

ایک[1] تو علی گڑھ کا دورہ کیا اور وہاں ان کی عالی ظرفی اور وسعتِ قلب کا یہ مظاہرہ سامنے آیا کہ انہوں نے برملا فرمایا کہ:

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔۔ ۔۔۔۔۔ اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔"[1]

اور دوسرے جدید اور قدیم کے امتزاج کی سعی —— اور علی گڑھ اور دیوبند کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کرنے کے لئے مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں "جامعہ ملیہ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ پیش نظر مقصد کے اعتبار سے یہ تجربہ بھی ناکام رہا!

دوسری طرف تحریک استخلاصِ وطن کے ضمن میں ہندو مسلم اشتراک عمل کے نظری طور پر قائل اور اس پر بالفعل عامل ہونے کے باوجود مولانا کی نگاہِ حقیقت بین نے ہندوؤں کے طرزِ عمل کا بالکل صحیح مشاہدہ کر لیا اور ان کی نگاہِ دوررس سے ان کے آئندہ عزائم چھپے نہ رہ سکے چنانچہ جمعیت العلماء کے دوسرے اجلاس میں جو خطبہ صدارت انتقال سے چند روز قبل آپ نے ارشاد فرمایا اس میں یہ صحیح اشتباہ موجود ہے کہ:

"ہاں، یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں۔ کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں۔ کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات

---

[1] خود نوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنیؒ بحوالہ بیس بڑے مسلمان صفحہ ۲۸۸

میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے۔ کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو و مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔"[1]

بنا بریں ——— یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر مولاناؒ کی زندگی وفا کرتی تو بعد میں ہندوؤں کی جانب سے جس تنگ نظری اور کم ظرفی ہی نہیں منتقمانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوا اس کے پیش نظر مولانا یقیناً اپنے طریق کار پر نظر ثانی فرماتے اور کیا عجب کہ مسلمانان ہند کے جداگانہ قومی و ملی تشخص کے سب سے بڑے علمبردار اور اس کے تحفظ کے لئے عملی سعی و جہد کے "قائد اعظم" وہی ہوتے!

تیسری طرف اس واقعے کو ذہن میں لائیے جس کے راوی ہیں مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ ——— کہ اسارت مالٹا سے رہائی اور مراجعت ہند کے بعد ایک روز دارالعلوم دیوبند میں اکابر علماء کے ایک اجتماع میں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ہم نے تو اپنی اسیری کے زمانہ میں دو سبق حاصل کئے ہیں ——— اور جب علماء کرام، جن میں مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسے اکابر موجود تھے، ہمہ تن متوجہ ہو گئے کہ دیکھیں اس "استاذ العلماء" نے اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں کونسے دو نئے سبق سیکھے ہیں تو حضرتؒ نے فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی

---

[1] بیس بڑے مسلمان، صفحہ ۲۹۱

اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔
ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے
میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن
کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں
قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس
کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی
جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

(ماخوذ از وحدتِ اُمت، تالیف مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہٗ شائع کردہ مکتبۂ المنبر لائلپور)

پھر اس اعتراف واظہار ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک عام درسِ قرآن کی نشست کا
کا باقاعدہ بنفسِ نفیس اجراء فرمادیا۔ گویا اب احیائے دین اور تجدید ملت کے لئے کام
جس اساس اور نہج پر ہونا چاہیئے اس کی جانب رہنمائی فرمادی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے
کہ مولانا ہرگز لکیر کے فقیر نہ تھے بلکہ آخری عمر میں بھی مسلسل غور وفکر کی عادت برقرار تھی اور
بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق نقشۂ کار میں ضروری تبدیلی کرنے
کی اہمیت ان پر پوری طرح واضح تھی اور اُمت کے زوال وانحطاط کے اسباب پر ایک
ماہر معالج کے سے انداز میں تشخیص وتجویز پر ہمیشہ نظر ثانی کرتے رہنا آپ کی عادتِ ثانیہ تھی!

حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا سب سے بڑا مظہر مولانا آزاد کے
معاملے میں انؒ کا طرزِ عمل ہے! بڑے لوگوں کی بڑائی کا ایک اہم پہلو چھوٹوں کی بڑائی
کا اقرار اور ان کی ابھرتی ہوئی شخصیتوں کو خواہ مخواہ اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ کر انہیں
دبانے کی فکر کرنے کی بجائے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی صورت میں سامنے آتا
ہے۔ اور اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ عظمت کا کوہ ہمالیہ معلوم ہوتے ہیں حضرت شیخ الہندؒ۔
۱۹۱۲ء میں جب مولانا آزاد مرحوم نے "الہلال" نکالنا شروع کیا تو اس وقت
ان کی عمر کا کل چوبیسواں سال تھا! جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ساٹھ سے متجاوز ہو چکے تھے۔
اور جب ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کو "امام الہند" ماننے کی تجویز زیرِ غور تھی اس وقت وہ

بمشکل تیئس برس کے تھے جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ستر کے قریب پہنچ چکے تھے، گویا عمروں میں آدھوں آدھ سے زیادہ کا فرق و تفاوت تھا! ـــــ پھر کہاں جملہ علمائے ہندؒ کا بے تاج بادشاہ، انگریزی سامراج کے خلاف ڈٹ جانے والوں کا سرخیل ؒدیوبند ایسی عظیم درسگاہ کا صدر مدرس، اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے اکابر علمار کا اُستاذ، اور کہاں: ایک نوخیز نوجوان ـــــ جس کی زبان میں تاثیر قلم میں زور اور "وہ اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق جہاد کا جذبہ اور جوش تو بے شک موجود تھا لیکن نہ جبہّ و عمامہ نہ عبا و قبا، نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث، حتیٰ کہ نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت، ایک قرآن کا عاشق ہونے سے کیا ہوتا ہے، نہ کسی حدیث کی کتاب پر حاشیہ کا مصنّف، نہ فقہ کی باریکیوں کا مسلّم نکتہ دان، ـــــ باایں ہمہ اُس اُستاذ العلمار کا یہ قول ان کے شاگردوں کے حلقے میں معروف ہے کہ "اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!" اللہ اکبر! ہے کوئی حد اس وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی! فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝

مزید غور فرمائیے ہندوستان تقلید کا گڑھ ہے یہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں۔ اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اور بقول مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ "علمی کام" کا مطلب یہاں صرف یہ رہا

۱؎ واضح رہے کہ اس وقت تک دیوبندی اور بریلوی کی تقسیم عمل میں نہ آئی تھی اور جمعیت علمار ہند جملہ علمائے ہند کا مشترک پلیٹ فارم تھی!

۲؎ اس اعتبار سے مولانا کے مقام اور مرتبے کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مالٹا سے واپسی پر جس روز انہوں نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا اس روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے والوں میں نمایاں نام مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کے ہیں!

ہے کہ مسلک حنفی کی فوقیت دوسرے مسلکوں پر ثابت کی جائے [1] ـــــــــ
اور خود حضرت شیخ الہندؒ پکے حنفی تھے چنانچہ بیس بڑے مسلمان کے مرتب کے الفاظ میں خود ان کا حال یہ تھا کہ :

"مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے۔ لیکن جب امام ابو حنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے، تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف مزاج لوگ لوٹ لوٹ جاتے تھے ...." صفحہ ۲۴

دوسری طرف ابوالکلام آزاد حنفیت سے حد درجہ بعید تقلید سے کوسوں دور ایک آزاد خیال انسان، جس کی اصل عقیدت تھی امام ابن تیمیہؒ سے، ـــــ بایں ہمہ مولاناؒ ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں 'امام الہند' مان لینے کی تجویز کے پُرزور مؤید بھی ـــــ پھر غور کیجئے کہ ہے کوئی حد اس عالی ظرفی اور وسعت قلبی کی اور ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس دور میں! ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝

کاش کہ علمائے کرام ہماری ان گذارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ع " وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا ! "

واضح رہے کہ جمعیت علماء ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی تھی اور اگرچہ اس کے قیام کے وقت حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان سے باہر تھے تاہم چونکہ اس کے مؤسس اصلی مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد بھی تھے اور نہایت معتمد رفیق کار بھی۔ لہٰذا اس کی پشت پر۔ اصل کارفرما ذہن حضرت شیخ الہندؒ ہی کا تھا۔

[1] مولانا انور شاہؒ کے اس قول۔ کے راوی بھی مولانا مفتی محمد شفیعؒ ہی ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ آخری عمر میں مولانا پر شدید حسرت طاری ہو گئی تھی کہ پوری زندگی کس بے کار مشغلے میں بسر کر دی !

دوسری طرف اگرچہ اس میں چند ایک اہلحدیث عالم بھی شامل تھے۔ جیسے مولانا سید محمد داؤد غزنوی تاہم اس پر اصل غلبہ "حنفیت" ہی کا تھا خواہ اس کا دیوبندی ایڈیشن ہو خواہ غیر دیوبندی جیسے فرنگی محلی خیرآبادی، بدایونی اور بریلوی ان حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے آزاد منش شخص کے 'امام الہند' قرار دیئے جانے کی کسی تجویز کے زیرِ غور آنے کا سوال ہی ہرگز پیدا نہ ہو سکتا اگر اس کی پشت پر حضرت شیخ الہند کی پُرزور تائید ہی نہیں تحریک نہ ہوتی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی جسقدر شد ومد کے ساتھ اس تجویز کے لئے کام کیا مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ نے اس کا بھی کوئی امکان نہیں تھا اگر یہ ان کے استاذ اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش نہ ہوتی۔
—— رہا یہ مسئلہ کہ اس تجویز کے ناکام رہنے کا اصل سبب کیا تھا تو اگرچہ بظاہر احوال تو یہ نظر آتا ہے کہ حنفیت کی شدت یا روایتی اور مدرسی علم کا ادعا آڑے آگیا لیکن اصل سبب وہی ہے کہ " مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ " حضرت شیخ الہندؒ کا خلوص واخلاص اپنی جگہ پر لیکن علم وحکمت الٰہی سب سے اوپر ہے۔ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ وَلَا نَعْلَمُ وَتَقْدِرُ وَلَا نَقْدِرُ ! اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آیا احیائے اسلام کی اس براہ راست جدوجہد کے لئے ابھی ماحول ہی سازگار نہ تھا بقولِ شاعر

ع ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب !
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں !

یا جیسے کہ بعد کے حالات وواقعات سے ثابت ہوا۔ اس عظیم مقصد کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہی موزوں نہ تھی گویا:۔

ع نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی !
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی !

بہرحال ہمارے لئے اصل قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ابوالکلام کی دعوت کا وہ عنصر کونسا تھا جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ مولانا محمود حسنؒ دیوبندی ایسی

عظیم شخصیت کو مسحور کر دیا تھا۔ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی دعوت بنیادی طور پر دو امور کی جانب تھی ایک : قرآن ۔ اور دوسرے : جہاد

پہلے نکتے کی وضاحت کے لئے کفایت کرے گا حسب ذیل اقتباس جو ماخوذ ہے "البلاغ" کے پہلے شمارے سے جو شائع ہوا تھا ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو[1] :۔

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو۔ تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ـــ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے ؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ "لَا يُصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔"

اور دوسرے نکتے کے لئے کفایت کرے گی یہ حقیقت کہ جب مولانا آزاد نے توجہ دلائی اُس حدیث نبوی کی جانب کہ "اِنِّیْ اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: اَلْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ!" تو ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوا اہل علم کے حلقے میں کہ "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ" کے علاوہ بھی کوئی پانچ چیزیں تھیں جن کا حکم دیا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ـــــ اور جبکہ وہ پانچ ارکان ہیں قانونی اسلام کے ـــــ وہاں یہ پانچ ارکان ہیں حقیقی ایمان کے!!

[1] واضح رہے کہ لگ بھگ یہی زمانہ ہے حضرت شیخ الہندؒ کے ہندوستان سے عازمِ حجاز ہونے کا۔ جہاں سے واپسی پر آپ نے وہ جملے ارشاد فرمائے جو اس سے پہلے نقل ہو چکے ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ آج ساٹھ سال گذر جانے کے بعد بھی یہ دونوں نکات اتنے ہی غریب ہیں جتنے اس وقت تھے اور روایتی مدرسی علم اور فقہی و قانونی تصورات کے غلبے کے تحت حقیقی اسلام بالکل اسی طرح اجنبی اور غریب ہے جس طرح اپنے آغاز کے وقت تھا۔ کس قدر صحیح فرمایا تھا جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: "بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَ سَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاءِ ـــــ!

آج انہی غرباء کو پکارنے کی ایک نئی کوشش کا آغاز ہو رہا ہے تنظیم اسلامی[1] کے قیام کی صورت میں:۔ فَھَلْ مِنْ مُسْتَمِعٍ وَھَلْ مِنْ مُجِیْبٍ !

اس موضوع پر مفصل گفتگو انشاء اللہ آئندہ ماہ ہوگی ـــــ!

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد نے احیائے اسلام کے لئے جس جماعت کے قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ بالفعل قائم کر بھی دی تھی اس کا نام عام طور پر "حزب اللہ" معروف ہے لیکن عجیب حسن اتفاق ہے کہ "افاداتِ مہر" میں اس کا ذکر "اسلامی تنظیم" کے عنوان سے ہوا ہے چنانچہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم رقمطراز ہیں: "ہمارے مولانا (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۱۹ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو آپ کو یاد ہوگا کہ اسلامی تنظیم کی ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں مولاناؒ کو امام بنا کر کام کرنا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں ایک لاکھ روپے کی رقم مولانا محمد علی (رح) اور مولانا عبدالقادر قصوری (رح) ہی نے فراہم کی تھی لیکن ہمارے مولانا (رح) جلد دوبارہ گرفتار ہو گئے اور وہ تحریک بھی رہ گئی۔ روپیہ بھی گیا، کچھ نہ بنا" ـــــ واضح رہے کہ مولانا آزاد کے جملہ محبین و معتقدین نے اس پورے معاملے کو اس طرح گول مول رکھنا مناسب سمجھا ہے۔ چنانچہ کہیں بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو نہیں کی گئی۔ اور محترم پروفیسر چشتی صاحب والی روایت اتفاقاً درجِ "میثاق" نہ ہو جاتی تو غالباً اب بھی اس مسئلے کی تحقیق و تفتیش کا موقع پیدا نہ ہوتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ میں ہر کام کے لئے ایک وقت معین ہے جس سے نہ ایک منٹ مؤخر ہو سکتا ہے نہ مقدم !

جمعیت علماء ہند کے اجلاس لاہور

نومبر ۱۹۲۱ء

کا ذکر "افاداتِ مہر" تالیف ڈاکٹر شیر بہادر پنی میں

(۱) ایک ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کی زبانی جو ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے بطور سامع شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد اجلاس جمعیۃ علماء ہند کی صدارت | جب آپ تشریف لائے اور مسندِ صدارت سنبھالی تو فرمایا کہ "ابتدائی کارروائی تحریری خطبۂ صدارت کے پڑھنے سے کی جائیگی"۔ کسی شخص کو اپنا لکھا ہوا خطبہ پڑھنے کے لئے دیا۔ خطبہ کے تھوڑی دیر تک پڑھے جانے کے بعد لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ لوگ تو ان کی تقریر کے پیاسے تھے جب یہ ہل چل زیادہ ہوئی تو آپ غصہ میں اٹھے۔ تحریری خطبہ قاری کے ہاتھ سے لے لیا اور فرمایا "جو یہ سننا نہیں چاہتے وہ جا سکتے ہیں۔ جب چار پانچ منٹ تک ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ہال میں سخت سناٹا چھا گیا تو خطبہ پھر پڑھوانا شروع کرا دیا۔ جب یہ ختم ہوا تو اٹھے اور فرمایا "عزیزانِ من! میں اس لب و لہجہ کا عادی نہیں، لہٰذا معافی چاہتا ہوں" اس کے بعد تقریر شروع کی۔"

(۲) اور دوسرے مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے وہ لکھتے ہیں: "آپ نے کئی مجالس کا ذکر فرمایا۔ بریڈ لاہال والی مجلس (جلسہ جمعیۃ علماء ہند) اس روز منعقد ہوئی تھی جو میری اخبار نویسی کا پہلا دن تھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کی کوئی تاریخ تھی میں اس جلسے میں اول سے آخر تک رہا۔ مولاناؒ نے کھدر کی دستار نہایت عمدگی سے باندھ رکھی تھی۔"

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جو 'اسلامی تنظیم' ـــــ "حزب اللہ" کے نام سے قائم کی تھی اس کے بارے میں یہ تو یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ وہ کب ختم ہوئی اور آیا اسے کسی مرحلے پر باضابطہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا بھی گیا یا نہیں ـــــ البتہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی قائم کردہ "جماعتِ اسلامی" کی حیثیت اسی کے بروز یا ظہورِ ثانی کی ہے ـــــ

مولانا آزاد کی 'حزب اللہ' کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ اس کی اساس 'بیعت' پر تھی جبکہ 'جماعتِ اسلامی' ایک دستوری تنظیم ہے جس میں کم از کم نظری طور پر معاملات کی اصل باگ ڈور اس کے ارکان کے ہاتھوں میں ہے ـــــ اس ضمن میں ایک دلچسپ سوالیہ نشان مولانا مودودی مرحوم کے ایک خط سے سامنے آیا ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) کے مولانا محمد یونس صاحب کے نام تحریر کیا تھا۔ (جو ان کی مرتب کردہ کتاب "یادوں کے خطوط" میں شامل ہے جو اسی سال 'اسلامی مکتبہ۔ حیدرآباد دکن' نے شائع کی ہے) اس خط سے مولانا کا جو ذہن سامنے آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ "نبی اکرمؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں ....." اس کے لئے جو بھی جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کی اساس 'بیعت' پر ہونی چاہیئے ـــــ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسی سال (۱۹۴۱ء) کے اواخر میں جب انہوں نے "جماعتِ اسلامی" قائم کی تو اس کی تشکیل کے موقع پر 'بیعت' کے لفظ تک سے کیوں اجتناب کیا گیا!

مولانا مودودی کے خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے ـــــ (ادارہ)

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱ ۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہلِ مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہؓ کرامؓ سے اس امر پر بیعت کی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے۔

۲ ۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبیؐ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو۔ اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳ ۔ تیسری بیعت وہ ہے جو جماعتِ اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسولؐ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے۔ کیونکہ اس پر جماعتِ اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

(آخری قسط)

قرآن کا عجیب ہونا

محمد اقبال واحد

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ اس کے نزدیک معیارِ فضیلت بس ایک ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ جس کے نتیجہ میں خدا شناسی ہے خدا طلبی ہے خدا ترسی ہے خدا خوفی ہے۔ بندگیٔ رب ہے شہادتِ حق ہے اور یہ نہیں ہے تو کوئی مال و منال کوئی جاہ کوئی اقتدار کوئی حسب کوئی نسب کوئی علم کی بلند و بالا ڈگریاں کوئی وطنیت کوئی قومیت کسی نبی کا امتی ہونا نہ ہونا سرے سے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ ایک طرف وہ عظمت کردار کی وہ مثالیں پیش کرتی ہے کہ جو پوری انسانیت از ازل تا ابد بے مثل ہیں بے نظیر ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں۔ مثلاً نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا اپنی بیویوں کی ایذا رسانی پر صبر کرنا یوسف علیہ السلام کا چاہ کنعان میں مصر کے بازار میں بکا و مال ہونے پر امرأۃ العزیز کی شہوت رانی کے مقابلے میں صبر سے کام لینا۔ بے گناہ زندانی ہونے کی صورت میں وقار و تحمل اور جب اس وقت کی دنیا کی متمدن ترین مملکت مصر کے سربراہ ہوتے ہیں تو ان بھائیوں کو جنہوں نے ان پر بے پناہ ظلم ڈھائے تھے بلا توقف معاف کر دیتے ہیں۔ معاف ہی نہیں کرتے الٹا احسان و مروت سے کام لیتے ہیں۔ اور جب یونس علیہ السلام کے لئے مچھلی کا پیٹ قید خانہ بنا دیا جاتا ہے تو وہ خالق کا شکوہ نہیں کرتے اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کہتے ہیں۔ اور جب یحییٰ علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ تو اُف تک نہیں کرتے۔ ابراہیم علیہ السلام کے باپ بیٹے کو ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیتے ہیں تو وہ احتجاج تو کیا بلکہ دعائے مغفرت کا وعدہ کرتے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹوں کے ہاتھوں سالہا سال جس ابتلا سے واسطہ پیش آتا ہے تو فصبرٌ جمیل کہہ کر خدا کی مدد طلب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ اسماعیل علیہ السلام اپنے باپ سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ آپ کا خواب وحی

ہے یا آپ کا اپنا حکم ہے پورے استقلال کے ساتھ اپنے باپ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اپنی گردن چھری تلے رکھ دیتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السّلام فراعنہ کے جبر و استبداد کا نشانہ بنتے ہیں۔ وطن سے جلا وطن ہوتے ہیں۔ اپنی امّت کے ہاتھوں اذیتوں پر اذیتیں برداشت کرتے ہیں لیکن کلمۂ شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ عیسیٰ علیہ السّلام کو یہودی اپنے زعم میں تختۂ دار پر لا کھڑا کرتے ہیں اور وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا استقبال معاندین حق گالیوں سے پھبتیوں سے طعنوں سے بہتان تراشیوں سے یہاں تک کہ شعب ابی طالب میں محصور کر دیتے ہیں۔ حالت نماز میں پشت مبارک پر مردہ اونٹ کی اوجھڑی لا ڈالتے ہیں طائف کے بازار میں غنڈوں، شریروں اور بدمعاشوں سے پتھروں کی بارش برسوا دیتے ہیں۔ وطن سے جلا وطن کرتے ہیں۔ آپؐ کے رفقاء پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں جینا حرام کر دیتے ہیں۔ لیکن وہی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم محبوب ربّ العالمین جب ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن میں داخل ہوتے ہیں جہاں سے آپؐ کو نکالا گیا تھا تو ان دشمنوں نے جنہوں نے اپنی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، کے حق میں معافیٔ عام کا اعلان کر دیتے ہیں ——— دوسری طرف ان کرداروں کو بھی سامنے لاتی ہے جو انسانی بدکرداری کے اعتبار سے بدترین کردار کے لوگ ہیں محض اس لئے کہ مستقبل کے لوگ ان بدکرداروں کے کردار اور کردار کے نتیجہ میں کیفر کردار سے عبرت حاصل کریں۔ افراد میں سے فرعون نمرود ہامان قارون ابی لہب کو پیش کرتی ہے تو اقوام میں سے قوم صالح قوم لوط قوم شعیب بنی اسرائیل کی تباہیوں کی داستانوں کو بیان کرتی ہے کہ وہ انکار حق کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹیں کہ دنیا کی کوئی آنکھ ان کی ہلاکت پر رونے والی نہیں تھی۔

اور جب وہ اہل ایمان اور منکرین ایمان کا تقابل کرتی ہے تو اہل ایمان کے فضائل خصائل و مناقب بیان کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتی۔ اگر صالحین کے درجات کا تعیّن کرتی ہے تو منکرین کے درجات کو بھی متعیّن کرتی ہے۔ اہل ایمان کو بشارت دیتی ہے تو اہل کفر کو انذار دیتی ہے اور جب اہل ایمان کو اہل یقین کو مجاہدین فی سبیل اللہ کو انفاق کی ترغیب دیتی ہے۔ تو اسے قرض حسنہ

سے تعبیر کرتی ہے جو خالق دو جہاں، وہ خالق جو کائنات کے تمام تر ذخائر کا مالک ہے، کے ذمہ واجب الادا قرض قرار دیتی ہے اور جب اہل ایمان اپنی جان کی بازی لگا کر باطل کا مقابلہ اس کے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں بے سروسامانی کی حالت میں اقامت دین اقامتِ حق کے جذبہ کے ساتھ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہ کہہ کر میدانِ کارزار میں اترتے ہیں تو وہ ذات جو کائنات کی ہر شے کی ناصر ہے، اسے اپنی نصرت قرار دیتی ہے۔ اور پھر اس نصرت خداوندی کی وہ قدر افزائی کرتی ہے کہ ان کو ایسی حیات جاودانی عطا کرتی ہے جس میں موت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ گویا جن کی حیات کے تسلسل کو موت نہیں توڑ سکتی وہ دنیا کی زندگی میں بھی زندہ ہیں اور برزخ میں بھی زندہ ہیں اور عالم حشر میں بھی زندہ ہیں اور عالم جنّت میں بھی زندہ ہیں ——!!

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ اس نے ہر انسان کے اندر نیکی اور بدی حق اور باطل خیر و شر خوب و زشت انکار و اقرار کو الہام کر دیا ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا کہ وہ نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی سمجھنے پر مجبور ہے کہ یہ اس کا داعیہ فطری ہے۔ داعیہ وجدانی ہے۔ جس طرح بھوک اور پیاس جذبہ جنسی اس کا داعیہ فطری اور وجدانی ہے جب تک وہ ان داعیات مطلوباتِ مادی کا انکار نہ کر دے۔ جو اس کے بس سے باہر ہے وہ اس داعیہ کا بھی انکار نہیں کر سکتا جو اس کی روح کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی عجیب کہ انسان کو جبر و قوّت سے اس انقلاب قلوب و اذہان تک نہیں لاتی حالانکہ اگر اس کا خالق ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا وہ انسانی عقل کو اپیل کرتی ہے کہ وہ سوچے کہ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے اور اس مقصد تخلیق کو اس نے کسی معمّہ کی شکل میں انسان کے سامنے نہیں رکھا ہے۔ پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے الفاظ میں یعنی عبادت رب اور عبادت کے اور شہادتِ حق اور شہادتِ حق کے بعد اقامت حق نہ وہ عبادت رب کو محدود معانی میں لیتی ہے نہ شہادت علی الناس کو محدود معانی میں نہ اقامت حق کو محدود معانی میں جب وہ ایک مومن

سے عبادتِ رب کا تقاضا کرتی ہے تو پوری زندگی زندگی کے عام گوشوں شعبوں اور حصص میں اس کے نفاذ کو متعین کرتی ہے۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اور جب وہ شہادت علی الناس کا مطالبہ کرتی ہے تو محض کسی خاص ماحول اور معاشرہ تک نہیں پوری نوع انسانی کے بالمقابل لازم قرار دیتی ہے کہ اپنے قول و عمل سے اپنے فکر و کردار سے اس دین کے شاہد بنو جس دین کو تم نے اپنی زندگی میں دین جان کر اپنایا ہے اور جب وہ اقامت حق کا مطالبہ کرتی ہے تو پورا خطۂ ارضی اس کی زد میں ہوتا ہے۔ وہ فرض قرار دیتی ہے خدا کی زمین پر خدا کی سروری خدا کی جہانبانی خدا کی حاکمیت کے سوا ہر نوع کی حاکمیت باطل محض ہے۔ جس باطل محض کو پادر ہوا کر کے تمہیں دین خداوندی کو قائم کرنا ہے۔ اور اگر اس میں تم نے کسی جان و مال کی قربانی کسی وقت و اوقات کی قربانی سے دریغ کیا تو تم اپنے دعوئ ایمان میں کاذب ہو گئے۔ تو پھر جان لینا کہ تمہارا مقام دنیا و آخرت میں صدیقین کے درمیان نہیں ہو گا ــــ مکذبین کے درمیان ہو گا۔ خواہ تمہارے نام عبداللہ اور عبدالسلام ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی نادر کہ خسران زیان ناکامی کامیابی بلندی پستی عزت ذلت کے جو پیمانے اور معیارات اہلِ دنیا کے نزدیک ہیں وہ ہوں گے اس کے اپنے پیمانے اور معیارات ہیں۔ اور وہ اہل دنیا کے پیمانوں اور معیارات سے قطعی اوپر سے لے کر نیچے تک اور نیچے سے لے کر اوپر تک مختلف ہیں۔ دنیا کی کامیابی تکاثر مال ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک اصل کامیابی انفاق مال ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک جو خسران ہے وہ اتلاف جان و مال ہے۔ جب کہ اللہ کے نزدیک اصل خسران عدم یقین و ایمان ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک ناکامی کسی دنیاوی مقصد میں ناکام ہو جانے کا نام ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک ناکامی یہ ہے کہ ایک اہل ایمان کی جماعت بھی موجود ہو۔ اہل دین اور اہل حق زندہ اور پائندہ ہوں لیکن خدا کی زمین پر بسنے والے انسان نظام عدل و قسط سے محروم ہوں۔ اہل دنیا کے نزدیک معیار عزت و اکرام کچھ بھی ہو جبکہ اس کے نزدیک جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا معیارِ اکرام تقویٰ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اہل دنیا کے نزدیک جو قوت ہے وہ تیغ و تفنگ کی قوت ہے۔ عددی و افرادی قوت ہے جب کہ اس کے نزدیک اصل قوت ایمان و یقین کی قوت ہے۔ اہل دنیا

کے نزدیک ذلت بے کسی بے بسی لاچاری کا جو تصور ہے وہ قلتِ مال و منال ہے۔ عدم جاہ و اقتدار ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک فقدانِ عرفانِ خداوندی ہے۔ اہلِ دنیا کے نزدیک وقعت وہ ہے جو دنیا میں ایک شخص کو حاصل ہے خواہ وہ چور ہے ڈاکو ہے۔ طالع آزما حکمران ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک اصل وقعت جو ہے وہ وہ ہے جو آخرت میں اہلِ ایمان و یقین کو حسنِ کردار کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ہے

یہ کتاب کہتی ہے کہ اس کائنات کا دوام و قیام اور اس کائنات کی ہر شے کی بنیاد و اساس توحید خداوندی یعنی حاکمیت خداوندی پر قائم و دائم ہے۔ یہ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ انسانوں کی فلاح و بقا نجات و صلاح کا بحیثیت عمومی اور بحیثیت مجموعی جس شے پر انحصار ہے، دوام ہے قیام ہے قرار ہے استقرار ہے وہ توحید ہے اور جب کبھی بھی ایک انسان نے یا بہت سے انسانوں نے توحید یعنی حاکمیت خداوندی سے راہ گریز و فرار اختیار کی ہے تو آخرت کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا دنیا میں ہی وہ فرد افراد تباہی و بربادی زیان و خسران سے دوچار ہو کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے نزدیک محض حق تعالیٰ کی مالکیت کو تسلیم کر لینا کوئی کارنامہ نہیں ہے وہ تو کوئی تسلیم کرے نہ کرے اپنے زور و بل پر قائم ہے کہ اس کی حاکمیت بھی تکوینی لحاظ سے اس کی ضرورت مند نہیں ہے کہ کوئی اسے تسلیم کرے۔ تو وہ قائم ہو۔ وہ از خود باخود ذی روح سے لے کر غیر ذی روح تک کائنات کی ہر شے پر بالقوہ قائم ہے۔ البتہ حاکمیت کا ایک گوشہ جو اختیاری ہے اور جس کا تعلق انسان کی قوتِ اختیار و تمیز سے ہے اس کے بارے میں جس حاکمیت کا نام اس کی زبان میں توحید خداوندی ہے وہ تسلیم کرانا اور تسلیم کرانے کے بعد زندگی کے تمام گوشوں میں انفرادی گوشوں سے لے کر اجتماعی گوشوں تک قائم کرانا چاہتی ہے۔ قائم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور یہی ہے وہ بات جسے قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتے ہوئے خالق کائنات نے کہی ہے کہ آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنے نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ آپ ایسے شخص کی ذمہ داری کس طرح سے لے سکتے ہیں۔ گویا اگر کوئی شخص اپنے نفس کی مرضیات کی تابعداری کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کی حاکمیت اور الوہیت کو خدا کی حاکمیت اور الوہیت کے بالمقابل لا کھڑا کرتا ہے۔ کوئی سماج کوئی سوسائٹی کوئی معاشرہ کوئی جماعت کوئی قوم کوئی ملت جب یہ رویہ اختیار کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں

وہ رویہ اپناتی ہے جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہے تو گویا وہ خدا کی حاکمیت اور الوہیت کو چیلنج کرتی ہے اور اگر کوئی شاہی کوئی بادشاہی کسی ملک کی کوئی صدارت کوئی وزارت کوئی قانون ساز کوئی ایوان پارلیمان اپنے اہلِ وطن کے لئے اپنی مرضی سے یا جمہور کی مرضی سے جسے مغربی پارلیمانی جمہوریت کہتے ہیں، کے ذریعہ قوانین نافذ کرتی ہے جو قرآن اور سنّت سے متغائر یا متصادم ہوتے ہیں تو وہ بڑے پیمانے پر قوم اور ملک کے پیمانے پر خالق کائنات کی حاکمیت ساورنٹی یا الوہیت کا انکار کرتی ہے تو جان لینا چاہیئے کہ قرآن کے نزدیک اس کتاب کے نزدیک یہ تمام صورتیں شرک ہیں جن میں سے ایک ایک صورت کے نوع شرک ہونے میں اہلِ علم کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔

یہ کتاب نہ انفرادی ملکیت کی قائل ہے نہ اجتماعی ملکیّت کی۔ اس کا تصوّر ملکیّت اپنا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو جو جو نعمتیں اس ارضی و فانی زندگی میں حاصل ہیں وہ منجانب پروردگار ہیں اور وہ ایک وقت موقت تک کے لئے ان نعمتوں کا امین ہے جس میں سے ہر نعمت کے بارے میں اسے نعمت دہندہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

یہ کتاب جس موضوع کی حامل ہے یعنی انسان سازی اس کا موضوع ہے اس کی تمام تعلیم اس موضوع کے گرداگرد گھومتی ہے اور اس موضوع پر وہ اپنے تمام حسن کلام کو اسلوب کلام کو تراکیب کلام کو استدلال کلام کو نظم کلام کو علم کلام کو استعمال میں لاتی ہے۔ اس موضوع کے سوا اسے کسی اور موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تکوین سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے۔ شان نزول سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے شان ترتیب سے استدلال کرتی ہے تو اس کے لئے کردار اہل ایمان و اہل کفر سے استدلال کرتی ہے پھر وہ اپنے اظہار ـــــ میں ایک لفظ تک ایسا استعمال نہیں کرتی جس کو سمجھنا عام انسانی عقل کے لئے دشوار ہو۔ اس کتاب نے خالق کا جو تصوّر پیش کیا ہے کثیر التعداد اسماءِ حسنیٰ کے ذریعہ غیر الہامی کتب تو کجا کوئی الہامی کتاب تک پیش نہیں کر سکتی یعنی وہ ذات عالی جو اس کائنات کی خالق ہے۔ چارہ ساز ہے چارہ گر ہے اپنی ذات و صفات میں واحد و احد ہے۔ بے مثل و بے مثال ہے بے نظیر و لاجواب ہے۔ یکتا و یگانہ ہے۔ الحیّ والقیوم ہے۔ القادر والمقتدر ہے

الرحمان الرحیم ہے۔ غفور غفار ہے صبور و شکور ہے۔ علیم و خبیر ہے۔ سمیع و بصیر ہے۔ نافع و ضار ہے محیی و ممیت ہے۔ واجد ہے ماجد ہے۔ قابض و باسط ہے۔ مصوّر و باری ہے۔ عظیم و علیم ہے۔ علی و کبیر ہے۔ کریم و حکیم ہے۔ قوی و متین ہے۔ اول و آخر ہے۔ ظاہر و باطن ہے۔ مقدم و مؤخّر ہے۔ نور علیٰ نور ہے۔ کل یوم ھو فی شان ہے۔ ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر ہے۔ ان اللہ بکل شئی علیم ہے اِنّ اللہ عَلیٰ کُلِّ شَئٍ شہید ہے۔ اس کی صفات لامحدود اس کا علم ناپیدا کنار اس کی وسعتیں حدود فراموش۔ اس کی قوتیں بے پناہ اس کی طاقتیں بے اندازہ وہ ہر لحاظ سے ماوراء الوراء ثم ماوراء الوراء

اس کتاب نے نبوّت و رسالت کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ پرانے تصوّرات حلول و اوتار سے مختلف ہے کہ وہ خالق کائنات کے فرستادے ہیں۔ پیغام بر پیامبر ہیں۔ شاہد ہیں مشہود ہیں سراج منیر ہیں۔ ہادی اور راہ نما ہیں۔ قائد و پیشوا ہیں۔ ان کی زندگیاں اور سیرتیں نوع انسانی کے لئے نمونہ ہیں۔ اسوہ حسنہ ہیں۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ وہ بشر ہیں اور بشریت کے تمام تقاضوں سے متصف ہیں لیکن پوری نوع بشری کے لئے ہدایت کا روشن چراغ ہیں جس کی روشنی سے جہان معنوی چکاچوند ہے۔ اس کتاب نے آخرت کے بارے میں جو تصوّر پیش کیا ہے وہ قدیم تصوّرات آواگون اور تناسخ سے قطعی مختلف ہے کہ ایک دن قیامت کا ہے اور قیامت کا دن روز قیامت ہے۔ روزِ احتساب ہے۔ روزِ بازپرس روز جواب دہی ہے۔ جس میں ایک ایک فرد ایک ایک قوم کو اپنی —— حیاتِ دنیاوی کی کارگزاری کے ساتھ دورِ احتساب سے گذرنا ہے۔ جس کے نتیجہ میں حیاتِ جاودانی ہے۔ جنّت کی صورت میں بھی اور جہنّم کی صورت میں بھی۔ جہاں نہ کوئی سعی ہے نہ کوئی سفارش ہے نہ کوئی بدلہ ہے نہ کوئی ہدیہ ہے۔ نہ کوئی شفاعت ہے اِلّا باذن اللہ۔

ایک بات جو اوپر عرض کرنے والی تھی وہ رہ گئی ہے اب عرض کئے دیتا ہوں۔ اس کتاب نے اگر رعایت اسباب کا حکم دیا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے تو خارق اسباب امور کو بھی منظر کیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ انسان اسباب کا نہ ہو کر رہ جائے۔ شرک فی الاسباب سے نجات حاصل کرے۔ اس کائنات میں جو

فیکٹر ہے جو اصل کارکردگی ہے وہ مشیّت کو ہے۔ اسباب تو محض درجۂ حجاب میں ہیں۔ محض ایمان بالغیب کے لئے ہیں۔

میں اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو وہی ہے جو ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کے نزدیک دین یعنی نظامِ زندگی دین خداوندی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نہ دین الملک نہ دین جمہوریت نہ دین سوشلزم نہ دین سرمایہ داری نہ دین ملوکیت نہ دین نفس نہ دین ابلیس اگر کسی کو جینا ہے تو سوچ سمجھ کر اس دین کے زیرِ سایہ جیئے اور اگر کسی کو مرنا ہے تو سوچ سمجھ کر مرے کہ اس دین سے انحراف کے کیا نتائج ہوں گے۔

اور آخری بات اس کتاب کا معجز نما ہونا۔ جو پورے طور سے ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ عرصہ ہوا کہ پڑھی تھی جو اغلب یہ تھی کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے جو الفاظ ہیں وہ ۱۹ ہیں، قرآن کی کسی بھی سورت کے اعداد کو اگر ۱۹ سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب انیس ہوگا۔ یہ ایک مصری مہندس کی تحقیق ہے۔ کلامِ الٰہی کی حقانیت محض اس پر منحصر نہیں ہے تاہم یہ تحقیق خوب ہے۔ اس تحقیق کا جو مفاد ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک حرف ایک لفظ کی کمی بیشی کرنے کی ہر کوشش لاحاصل ہوگی۔

آخر میں تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس مقالے کے راقم کی زندگی میں چار عدد انیس کو حد درجہ کی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی میری تاریخ پیدائش ۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ ہے۔ یہ تین "انیس" ہوئے اور چوتھا انیس یہ ہے کہ اس عاجز کو مرکزی تنظیم اسلامی کی طرف سے فیصل آباد شہر کا جب ناظم مقرر کیا گیا ہے تو اس روز بھی ۱۹ تاریخ تھی اکتوبر کی اور کیا بعید ہے کہ جس روز اس عاجز کی موت واقع ہو وہ دن بھی کسی مہینہ کی انیس تاریخ کا دن ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں

فیصل آباد

یوں تو فیصل آباد میں پہلے بھی ڈاکٹر صاحب کے پروگرام ہوتے رہے تھے لیکن تنظیم میں شمولیت کے لحاظ سے کام شروع نہ ہو سکا تھا۔ ماہِ ستمبر میں فیصل آباد سے محترم محمد اقبال واحد صاحب نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی اور اپنے عزم اور انتھک جدوجہد کے ذریعہ ۱۲ افراد کو تنظیم میں شامل کر لیا۔ (محترم محمد اقبال واحد صاحب پہلے جماعت اسلامی ضلع گجرات کے امیر رہ چکے ہیں) ان کی درخواست پر امیرِ محترم فیصل آباد تشریف لے گئے اور پیپلز کالونی کی جامع مسجد رحمانیہ میں ۲۰ نومبر ۱۹۸۲ء کو بعد نمازِ عشاء خطاب فرمایا۔ تقریباً ۲ گھنٹے تک "ہماری دینی ذمہ داریاں اور ان کے لوازمات" ــــ قرآن حکیم اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں۔ کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ اختتام پر حاضرین کو دعوت دی گئی کہ اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو صبح ۹ بجے اسی مسجد میں تشریف لائیں تاکہ باہم افہام و تفہیم ہو سکے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۸۲ء کو تقریباً ۵۰ افراد تشریف لائے اور کوئی ۱½ گھنٹے تک نشست منعقد ہوئی اس کے بعد ان حضرات کو جو تنظیم میں شمولیت اختیار کر چکے تھے یا جو اب شامل ہونا چاہتے تھے۔ دعوت دی گئی کہ وہ جناب محمد اقبال واحد صاحب کے مکان واقع 837/8 پیپلز کالونی ۱ پر تشریف لے چلیں تاکہ بیعت لی جا سکے۔ چنانچہ مزید نو حضرات نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور تقریباً ½ ۱۱ بجے یہ محفل دعا مغفرت و استقامت پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس سفر میں جناب محمد سعید اسعد صاحب۔ جناب محمد احمد صاحب کے علاوہ راقم الحروف بھی موجود تھا۔ اسی سفر کے دوران ہمارے ایک رفیق جناب راجہ محمد اصغر صاحب جو پہلے لاہور میں وسطی تنظیم میں تھے، سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بھی ان خطابات میں شمولیت اختیار کی ــــ قیام و طعام کا انتظام جناب احسان الٰہی ملک صاحب رفیق تنظیم اسلامی کے ہاں رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ ہم مشکور ہیں جناب شمس الرحمان افغانی خطیب مسجد رحمانیہ کے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ بہترین انتظام فرمایا۔ بلکہ خود بھی خطاب میں موجود رہے۔

نظام آباد / وزیر آباد (۲۳ نومبر ۸۳ء بروز بدھ) محمد سعید کھوکھر صاحب اپنے ایک عزیز کے ہمراہ تشریف لائے تاکہ امیرِ محترم کو نظام آباد ساتھ لے جا سکیں جہاں پر انہوں نے دعوتی خطاب کا انتظام کیا ہوا تھا۔ راقم الحروف اور جناب شمس الحق صاحب بھی ساتھ ہو لئے۔ جناب کھوکھر صاحب نے اپنے ہاں معززینِ شہر کو کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس لئے ہم مغرب سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ اور عشاء تک مختلف حضرات ملاقات کے لئے تشریف لائے اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ بعد نمازِ عشاء نظام آباد کی مسجد مبارک اہلحدیث میں امیرِ محترم نے قرآن مجید اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں واضح فرمایا کہ انسان کو کن فرائض کے بارے میں یاد دہانی کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کیا طریقہ اختیار فرمایا اور بحیثیت مسلمان ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں ــــ تقریباً ۲ گھنٹے کے خطاب کے بعد حاضرین کو دعوت دی گئی کہ اگر اس بارے میں مزید وضاحت مطلوب ہو تو جناب محمد سعید کھوکھر صاحب کے مکان پر تشریف لائیں کیونکہ صبح کو واپس لاہور آنا ضروری تھا۔ کچھ حضرات تشریف لائے اور تقریباً

ایک گھنٹے تک گفتگو جاری رہی۔ راقم الحروف کو چونکہ صبح راولپنڈی اور ایبٹ آباد جانا تھا اسی لئے اسی وقت واپس آنا پڑا لیکن امیر محترم نے وہاں بھی قیام فرمایا۔

صبح پانچ افراد نے بیعت کی جن میں جناب محمد سعید کھوکھر صاحب کی اہلیہ بھی شامل ہیں۔ جناب محمد سعید کھوکھر صاحب جس طرح سے اپنی بیماریوں کے علی الرغم محنت کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے لئے باعث رہنمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ہمیں بھی ایمان وصحت سے نوازے رکھے۔ ہم خطیب جامع مسجد اہلحدیث نظام پورہ اور منتظمین کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے بڑے جذبے سے اس کام میں تعاون فرمایا۔ مرتب: رحمت اللہ بٹر نائب امیر برائے پنجاب وسرحد

امیر تنظیم پنج پیر (صوابی) میں

محترم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نومبر کی ۱۳ تا ۱۵ تاریخ تک سہ روزہ دورہ پر پشاور تشریف لائے تھے۔ راستے میں امیر محترم مشہور عالم دین جناب مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ مولانا محمد طاہر صاحب موضع پنج پیر کے رہنے والے ہیں جو کہ جہانگیرہ سے تقریباً ۱۸ میل دور صوابی کے راستے پر ہے

امیر محترم کی یہ ملاقات جناب مولانا محمد طاہر صاحب سے بہت مختصر رہی اور کسی مفصل ملاقات اور گفتگو کے لئے مستقبل قریب میں کسی مناسب وقت پر ملنے کا وعدہ کیا گیا۔

امیر محترم اپنے اسی دورے کو نبھانے کے لئے ۱۴ دسمبر کی صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے خیبر میل کے ذریعے جہانگیرہ ریلوے سٹیشن پہنچے وہاں امیر محترم کو خوش آمدید کہنے کے لئے تنظیم کے ایک رفیق محمد سلیمان صاحب موجود تھے۔ امیر محترم ان کے ہمراہ کار میں جہانگیرہ سے پنج پیر کے لئے روانہ ہوئے۔ فجر کی نماز تک امیر محترم موضع پنج پیر پہنچ چکے تھے اور وہاں کی جامع مسجد میں لوگوں کے اصرار پر نماز فجر پڑھائی۔

بعد از نماز فجر آپ محمد سلیمان صاحب کے ہمراہ ریٹائرڈ کرنل شارس خان کے ہاں تشریف لے گئے۔ ناشتے کا انتظام وہیں تھا۔ ناشتے کے بعد امیر محترم آرام کی غرض سے لیٹ گئے اور دس بجے تک آرام فرمایا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے امیر محترم مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ مولانا محمد طاہر صاحب نے بڑے تپاک سے امیر محترم کو خوش آمدید کہا اور چونکہ حجرے کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی چنانچہ تمام اصحاب وہیں صحن میں چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہے۔

امیر محترم کی مولانا محمد طاہر صاحب کے حجرے میں آمد سے تھوڑی دیر پہلے پشاور کے تین رفقاء جناب صلاح الدین صاحب، خورشید انجم صاحب اور راجہ سردار احمد صاحب مولانا محمد طاہر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ چکے تھے۔

مولانا محمد طاہر صاحب ایک جید عالم دین اور مفکر ہیں۔ آپ نے دیوبند سے ۱۹۳۴ء میں فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۳۸ء میں مکہ مکرمہ میں ایک سال تک مولانا عبید اللہ سندھی سے درس کا فیض حاصل کیا اور پھر چند مدارس میں پڑھانے کے بعد مستقل طور پر اپنے گاؤں تشریف لے آئے اور ایک مدرسہ قائم کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ شرک اور بدعت کے خلاف جہاد ہے۔ جس کی وجہ سے ارد گرد کے ماحول سے خصوصاً اور دور دراز سے عموماً بہت سی مشرکانہ بدعات کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ جماعت توحید والسنہ کے مرکزی صدر بھی ہیں۔ اس جماعت کا مقصد عوام میں توحید وسنت رسولؐ کا احیاء ہے۔

امیر محترم اور مولانا محمد طاہر صاحب کی گفتگو کا آغاز مولانا سندھیؒ کے حوالے سے ہوا اور مولانا محمد طاہر

صاحب نے مولانا سندھی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑے دلچسپ انداز میں گفتگو فرمائی۔ آہستہ آہستہ گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور امام ابن تیمیہؒ اور امام غزالیؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تک کی شخصیات اور ان کا علم و عمل زیر بحث رہا۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کا پیغام جہاد و سلسلہ بیعت بھی موضوع گفتگو رہے اور اسی مناسبت سے تحریک مجاہدین کے مختلف پہلوؤں پر بھی دونوں اہل علم حضرات کے درمیان کافی دلچسپ بات چیت ہوئی اور آخر میں ملکی حالات اور اسلامی تحریکوں کا انتہائی محققانہ جائزہ لیا گیا۔ اور احیاءِ اسلام کے لئے کی گئی کوششوں اور مستقبل میں ان کوششوں کے اثرات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ اس نشست کے دوران تقریباً ساڑھے گیارہ بجے راولپنڈی کے امیر جناب عبدالصمد صاحب بھی تشریف لے آئے۔

اسی دوران مولانا طاہر احمد صاحب نے امیر محترم کو اپنی چند تصانیف بطور تحفہ پیش کیں۔ مولانا صاحب کی یہ تمام تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے یہ نشست اختتام کو پہنچی اور کھانے کا دور شروع ہوا۔

محمد سلیمان صاحب نے انتہائی پُر تکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا اور دس بارہ مہمان کھانے میں شریک ہوئے۔ کھانے کے بعد نمازِ ظہر مولانا محمد طاہر صاحب کی امامت میں ادا کی گئی۔ بعد از نماز امیر محترم نے کچھ دیر کے لئے آرام کیا اور سوا تین بجے کے قریب نیند سے بیدار ہوئے اور نماز کی تیاری فرمائی۔ اس وقفہ کے دوران باقی رفقاء اور مہمان مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا محمد طاہر صاحب نے امیر محترم کو اپنے ذاتی کتب خانے کی سیر کروائی۔ جہاں پر کافی نادر، نایاب اور قیمتی کتب دیکھنے میں آئیں۔ بعد میں امیر محترم نے مولانا طاہر صاحب کو چند کتب تحفتہً پیش کیں۔

ان تمام امور کی انجام دہی کے بعد تمام اصحاب پھر صحن میں تشریف فرما ہو گئے اور وہیں پر چائے وغیرہ پی اور مختلف علمی امور پر بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔

مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے ہی امیر محترم رفقاء اور چند دوسرے اصحاب کے ہمراہ جامع مسجد کی جانب روانہ ہوئے۔ کیونکہ مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا درس تھا۔ جس کے لئے ارد گرد کے تمام دیہات میں متعدد بار اعلانات کروائے جا چکے تھے۔ اس لئے امیر محترم کے جامع مسجد پہنچنے سے قبل ہی مسجد میں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے انہوں نے امیر محترم کا بڑا پُر تپاک استقبال کیا اور امیر محترم کو مسجد میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہو گئی اور تمام لوگوں نے امیر محترم کی اقتداء میں نماز ادا کی۔

نماز کے بعد تھوڑی دیر تک انتظار کیا گیا اور تقریباً ساڑھے پانچ بجے امیر محترم نے درس کا آغاز کیا۔ درس کا موضوع "توحید و سنت کا عملی پہلو" تھا۔ اس موضوع پر امیر محترم نے تقریباً پونے دو گھنٹے تک انتہائی مدلل و مؤثر اور فصیح و بلیغ خطاب فرمایا۔ جسے لوگوں نے توجہ، احترام اور ذوق و شوق سے سنا۔ مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسجد میں موجود تھی اور دور دراز کے دیہات سے بھی کافی لوگ درس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔

درس کے بعد عشاء کی نماز ادا کی گئی اور بعد از نماز سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں کافی لوگوں نے متعدد امور کے بارے میں سوالات کئے جن کے انتہائی مدلل اور تسلی بخش جواب دیئے گئے۔ انہی میں ایک صاحب شیر اعظم خان جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تقریباً تمام تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہوا ہے۔ انہوں

نے ایک لمبے چوڑے کاغذ پر بیس سوالات لکھے ہوئے تھے جن میں سے چند کے جوابات امیرِ محترم نے اسی وقت دیئے اور بقیہ جوابات کے لئے انہیں دوسرے دن صبح آٹھ بجے کا وقت دیا اور اس طرح یہ سلسلہ سوال و جواب اختتام کو پہنچا اور امیرِ محترم واپس مولانا طاہر صاحب کے حجرے میں تشریف لے گئے۔

درس کے دوران تنظیم اسلامی کے رفقاء نے مسجد کے اندر ہی مکتبہ لگایا جس میں لوگوں نے بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اچھی خاصی کافی تعداد میں کتب خریدیں۔

مولانا طاہر صاحب نے رات کے کھانے کا انتہائی پُر تکلف اور پُر اہتمام انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے کے دوران امیرِ محترم سے ملنے کے لیئے دو اصحاب تشریف لائے جو چودہ میل دور کے ایک گاؤں کالوخان سے آئے تھے۔ کھانے کے بعد امیرِ محترم نے ان اصحاب کے ساتھ مختلف امور پر گفتگو فرمائی اور ان کے رخصت ہونے کے بعد امیرِ محترم آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔

صبح ناشتے کے دوران بھی مختلف علمی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ یہ نشست کافی دیر تک جاری رہی پھر مولانا صاحب وہاں سے تشریف لے گئے کیونکہ مختلف لوگ امیرِ محترم سے ملاقات کی غرض سے اور سوال و جواب کیلئے آنے شروع ہو گئے۔

صبح کی اس نشست میں پنج پیر کے ایک عالم جناب مولانا محمد غفور صاحب بھی امیرِ محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ مولانا موصوف بھی مدرسۂ دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں اور آپ وہیں جامع مسجد میں درسِ قرآن دیتے ہیں۔ مولانا موصوف نے تنظیمی امور میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور "عہد نامہ" اور دوسری اہم کتب حاصل کیں۔ یہاں پر مدرسے کے ایک طالب علم جو کہ خود بھی مختلف مدارس میں درس دیتے رہتے ہیں، انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی اور تنظیم میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا اور کچھ عرصہ بعد "قرآن اکیڈمی لاہور" آنے کا وعدہ کیا۔

یہ نشست تقریباً سوا نو بجے تک جاری رہی اور تقریباً پندرہ بیس اصحاب نے امیرِ محترم سے ملاقات کی۔ اور مختلف سوالات کیئے جن کے تسلی بخش جوابات دیئے گئے۔

سوا نو بجے کے قریب مولانا صاحب تشریف لائے اور چونکہ کار بھی آچکی تھی۔ لہٰذا تیاری کر کے امیرِ محترم باقی تمام رفقاء کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہوئے جبکہ مولانا طاہر صاحب امیرِ محترم کو گاڑی تک چھوڑنے کے لئے تشریف لائے اور بھی بہت سے اصحاب امیرِ محترم کے ساتھ کار تک آئے اور انہیں بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

واپسی میں رفقاء اور امیرِ محترم پنج پیر سے زیدہ کے راستے جہانگیرہ آئے۔ جہاں پر پشاور سے آئے ہوئے رفقاء گاڑی سے اتر گئے اور امیرِ محترم جناب عبدالصمد صاحب کے ہمراہ راولپنڈی بذریعہ کار روانہ ہو گئے۔ اور اس طرح یہ پروگرام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیابی سے اختتام کو پہنچا۔

ملتان

اس مرتبہ امیرِ تنظیم کا دورۂ ملتان بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ نہ صرف یہ کہ ربیع الاول کے مہینے میں سیرت النبیؐ پر پہلی تقاریر تھیں بلکہ رفقاء کی تربیت اور مقامی علماء سے تعارف بھی تھا۔

۶ دسمبر ۱۹۷۸ء کو عصر کے وقت جب امیرِ تنظیم کا ہوائی جہاز ایئرپورٹ پر رکا تو (ریٹائرڈ) کرنل حیدر ترین صاحب، امیرِ ملتان استقبال کے لیے موجود تھے۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد جب امیرِ موصوف ۲۵۔ آفیسرز کالونی پہنچے جہاں ان کے قیام کا

بندوبست تھا اور رفقاء وہاں موجود تھے۔ ان سے معانقہ کے بعد امیر تنظیم نے عصر کی نماز پڑھائی اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے کیونکہ پچھلے دو دن سے آپ مسلسل سفر میں تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد چائے کی ایک پیالی پی اور خانگڑھ کے لئے تیاری کی۔ روانگی سے چند منٹ پہلے محمد احمد صاحب المکتبہ لے کر تشریف لے آئے۔ انہیں بھی ساتھ لیا اور دو کاروں پہ یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا۔ محمد احمد صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وقت پر پہنچے ورنہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جلسہ کہاں ہونا ہے۔ خان گڑھ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو کہ ملتان سے ۲۲ میل کے فاصلے پہ ہے اور نوابزادہ نصراللہ خان کی رہائش گاہ وہیں ہے۔

امیر تنظیم کی تقریر کا اہتمام وہاں کی جامع مسجد فاروقیہ میں کیا گیا تھا جو کہ بہت وسیع اور کشادہ تھی۔ اونگی نماز کے بعد تقریباً آٹھ بجے تقریر شروع ہوئی۔ امیر موصوف نے رسالت مآبؐ بحیثیت ختم نبوّت اور ختم رسالت پر روشنی ڈالی اور فرق واضح کیا۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور سب لوگوں نے اس مدلّل تقریر کو بہت غور سے سنا۔ تقریر کے بعد مقامی لوگوں نے کھانے کا انتظام مسجد کے مہمان خانے میں کیا ہوا تھا جسے سب نے سیر ہو کر کھایا۔ تقریباً گیارہ بجے ہماری روانگی ہوئی اور بارہ بجے ہم ملتان واپس گھر پہنچے۔

۷ دسمبر: صبح نو بجے وہاڑی کے چھ رفقاء مع اپنے امیر کے بھی آگئے اور تربیتی پروگرام میں شامل ہو گئے۔ صبح دس بجے ناشتے سے فارغ ہو کر تربیت کی نشست ہوئی جس میں امیر موصوف نے سورۂ مائدہ کی آیات نمبر ۵۴۔۵۵۔۵۶ پر درس دیا اور واضح کیا کہ حزب اللہ میں ایک کارکن کے کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔ اس موقعہ پر تنظیم کے رفقاء کے علاوہ برادرم عبدالماجد خان کے والد بزرگوار اور ان کی فیکٹری کے ایک ساتھی جناب ظفر خان صاحب اور ان کے دو بیٹے بھی موجود تھے۔ دل کرتا تھا کہ امیر موصوف روزانہ درس دیتے رہیں تاکہ ہمارے ایمان کی شمع ہمیشہ روشن رہے۔ درسِ سورۂ مائدہ کے بعد کچھ سوال و جواب ہوئے جس میں ظفر خان صاحب کے چھوٹے بیٹے نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے بھائی کو دین کی خدمت کرنے کی استطاعت عطا فرمائے اور اقامتِ دین کو سمجھنے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کی توفیق بخشے (آمین)۔ ابھی گفت و شنید جاری تھی کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر اور ان کے دو ساتھی آن پہنچے۔ ان کی کوشش تھی کہ یونیورسٹی میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر امیر موصوف خطاب فرمائیں۔ امیر موصوف طلباء کے معاملے میں دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن یہ جان کر حیرت ہوئی کہ صدر صاحب جو کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے اور ناظم بھی رہ چکے تھے، کی داڑھی ندارد تھی۔ اور ان کے ایک ساتھی جو کہ جمعیت کے رفیق تھے سنّتِ رسولؐ پر کاربند تھے۔ امیر موصوف نے ان سے کہا کہ ان کے زمانے میں ایسا ناممکن تھا کہ ایک رکن ہو اور اس کی وضع قطع سنّتِ رسولؐ کے مطابق نہ ہو۔ بہرحال امیر موصوف نے اپنے پروگرام کو جمعہ ۹ دسمبر تک طول دے دیا۔ صدر صاحب بھی خوش ہو کر اٹھے اور ہمیں بھی دلی مسرت ہوئی کہ کچھ لمحے اور ان کی صحبت میں گزریں گے۔ راقم نے فوراً جا کر امیر موصوف کی ٹکٹ جمعہ کی صبح کی پرواز پر بک کرالی۔ دوپہر کا کھانا سب نے مل کر ترین صاحب کے گھر میں کھایا۔ اس کے بعد تمام رفقاء شام کے جلسے کی تیاری میں لگ گئے۔ اس موقعہ پر اگر میں جناب شفیع صاحب، یونس صاحب، عبدالغنی صاحب، عبدالرحمان خان صاحب، ماجد خان صاحب اور رفیق اقبال صاحب کی کاوشوں اور محنتوں کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی جنہوں نے اپنی انتھک جدوجہد سے پوسٹر لگوائے۔ ہینڈ بل تقسیم کرائے۔ اخبارات میں خبریں چھپوائیں۔ کتابت کروائی اور جلسگاہ کو بینرز سے آراستہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ شام کی تقریر کا سماں دیکھنے کے لائق تھا۔ ایک سیل رواں تھا جو تھمتا نہ تھا۔ کرسیاں پُر ہو گئیں تو فرش پر چادریں بچھا دی گئیں۔ لوگوں کا جوش اور جذبہ قابلِ دید تھا جو کہ اتنی سردی

میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر نہایت صبر و تحمل سے امیرِ تنظیم کی ولولہ انگیز تقریر سنتے رہے۔ تقریر سے قبل ترین صاحب نے تلاوت کی اور معانی پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور تنظیم اسلامی کے متعلق تعارفی کلمات کہے اور قرآن مجید کو پڑھنے، سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ امیرِ موصوف نے انقلابِ محمدی کے چھ مراحل کو قرآن کی روشنی سے واضح کیا اور ہمارے دینی فرائض کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بیان کیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ سیرت النبیؐ کے موضوع پر اتنی مدلل اور علمی تقریر کبھی نہیں سنی۔ واللہ اعلم!

تقریر کے بعد ایک صاحب جو فوج سے منسلک ہیں، نے امیرِ موصوف کے ہاتھ پر جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۸ دسمبر: صبح ۹ سے گیارہ بجے کا وقت سوال و جواب کے لئے مخصوص تھا جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ امیرِ موصوف نے نہایت صبر و تحمل سے لوگوں کو جوابات دیئے اور مفید مشورے بھی۔ ابھی سوالات باقی تھے مگر وقت کی کمی اور دوسرے پروگرام میں شرکت کے لئے یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ گیارہ سے ایک بجے تک ملتان کے علماء کے ساتھ امیرِ موصوف کی نجی ملاقات تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے علماء گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد شریف صاحب خلیفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا ابو معاویہ ضیاء صاحب مدرس مدرسہ علیدیہ
مولانا عبدالرحیم صاحب مدرس مدرسہ نعمانیہ۔ صاحبزادہ حافظ عبدالخیر فاضل مدرس مدرسہ علیدیہ
صاحبزادہ قدوسی، خطیب جامع مسجد عباد الرحمٰن۔ مولانا عطاء اللہ صاحب فاضل خیر المدارس
صاحبزادہ خلیل صاحب مدرس مدرسہ علیدیہ

مصافحہ و معانقہ کے بعد ملکی صورتحال اور دینی مسائل زیرِ بحث آئے۔ تمام علماء کرام امیرِ موصوف کی دینی خدمات کے معترف اور تعاون کے خواہش مند تھے۔ ہم تہِ دل سے ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں سے وقت نکالا اور ملاقات کی۔ کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک جھنڈے تلے جمع کر دے اور اقامتِ دین کے عظیم فرض کو نبھانے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

میں سمجھتا ہوں کہ امیرِ موصوف کا یہ اقدام ان کے خلوصِ نیت کا مظہر ہے کہ دین کی بنیادی باتوں پر اور اختلافی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر ہم متحد ہو سکیں۔ امیرِ ملتان ترین صاحب نے تمام موجود اصحاب کے لئے ظہرانے کا اہتمام کیا ہوا تھا اور اس موقع پر ان کی مہمان نوازی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جنہوں نے اپنے گھر بار کو تنظیمی اور دعوتی کاموں کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم واپڈا کالونی کی مسجد پہنچے۔ جہاں پر امیرِ موصوف نے سیرت النبیؐ پر اپنے مخصوص انداز میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد کچھ وقت ملا کہ ہم اپنی کمریں سیدھی کر سکیں۔

مغرب کی نماز کے بعد چائے کا دور چلا اور عشاء کے بعد دو کاروں پر مشتمل قافلہ یونیورسٹی روانہ ہوا۔ ابوبکر ہال طلباء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ آس پاس کھڑے تھے۔ کافی تعداد میں لوگ پچھلے برآمدے میں بھی کھڑے تھے۔ امیرِ موصوف کو کھڑے ہو کر تقریر کرنا تھی۔ انہوں نے انقلابِ محمدی کے ایک ایک پہلو کو اجاگر کیا۔ انقلابِ محمدی کا سرخ انقلاب اور فرانسیسی انقلاب سے موازنہ کیا اور پورے دھڑلے کے ساتھ بیان کیا کہ ہمیں انقلاب لانے کے لئے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ حضورؐ کے طریقے پر عمل کرنا ہوگا بلکہ ہدایت نامہ (قرآن پاک) کو ہتھیار بنا کر اپنے سینوں میں اتارنا ہوگا۔ تقریر کے اختتام پر تالیوں کی گونج اس بات کی مظہر تھی کہ نہ صرف انہوں نے بات کو سمجھا ہے بلکہ اسے سراہا بھی ہے۔

اس کے بعد مختصر سے وقت میں سوال و جواب کا سلسلہ ہوا اور یوں یہ مفید دورہ اختتام کو پہنچا۔

۹ دسمبر: امیرِ محترم کا جہاز سوا نو بجے روانہ ہونا تھا لیکن دھند کی وجہ سے ۱۲ بجے روانہ ہوا۔ ہمیں موقعہ ملا کہ ان کی صحبت سے مستفید ہوں۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی کے طالب علم اور راقم کے ہمسایہ جناب تحسین ملک نے امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر و استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۲ بجے راقم امیرِ محترم کو ائیرپورٹ پر الوداع کہنے گیا۔ امیرِ محترم بڑی شفقت سے بغل گیر ہوئے اور لاؤنج کی جانب بڑھے۔

مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا ممتاز ادارہ

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

عن انسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لایؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

رشید جیولری ہاؤس

لاہور

ٹمپل روڈ — سوہا بازار

۳۱۱۴۰ — ۳۰۴۳۳ — ۶۴۴۳۳ — ۵۶۲۷۹

پروپرائیٹر

اے وحید

امپورٹ - ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ

رین بو انٹرنیشنل

برآمدی اشیاء

آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ❖ بیڈ شیٹس
کاٹن کلاتھ ❖ کاٹن گارمنٹس ❖ احرام تولیہ ❖ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ❖ لکڑی کا فرنیچر۔

درآمدی اشیاء

لاکھ دانہ ❖ سٹکر فلم ❖ سوچ سٹارٹر
ربڑ لیٹکس ❖ پولیسٹر ریان۔

مرکزی دفتر

I فلور غلام رسول بلڈنگ ۶ شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور
ذیلی دفاتر:- کراچی - فیصل آباد۔

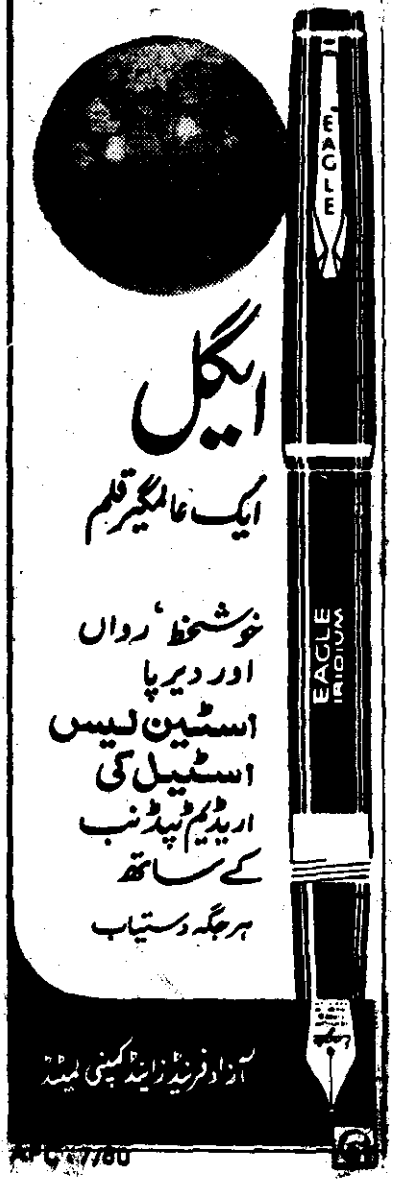

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی مطبوعات میں

ایک اہم اضافہ

★

سانحۂ کربلا

از

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

ایک اہم تقریر جواب کتابی شکل میں

شائع کی گئی ہے

صفحات — ۴۸

قیمت: ۳ روپے صرف

ملنے کا پتہ

۳۶ — کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون:- ۸۵۲۶۱۱

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

سورۃ الاسراء۔ الآیۃ ۸۲

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

۳۰۱، لنڈا بازار، لاہور۔ ۳۰۶۴۶۸ / ۳۰۵۴۶۱

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ
فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے

بڑے فوائد بھی ہیں۔

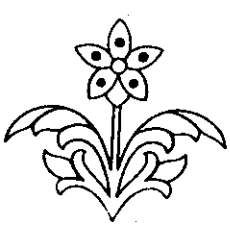

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپرس روڈ۔ لاہور

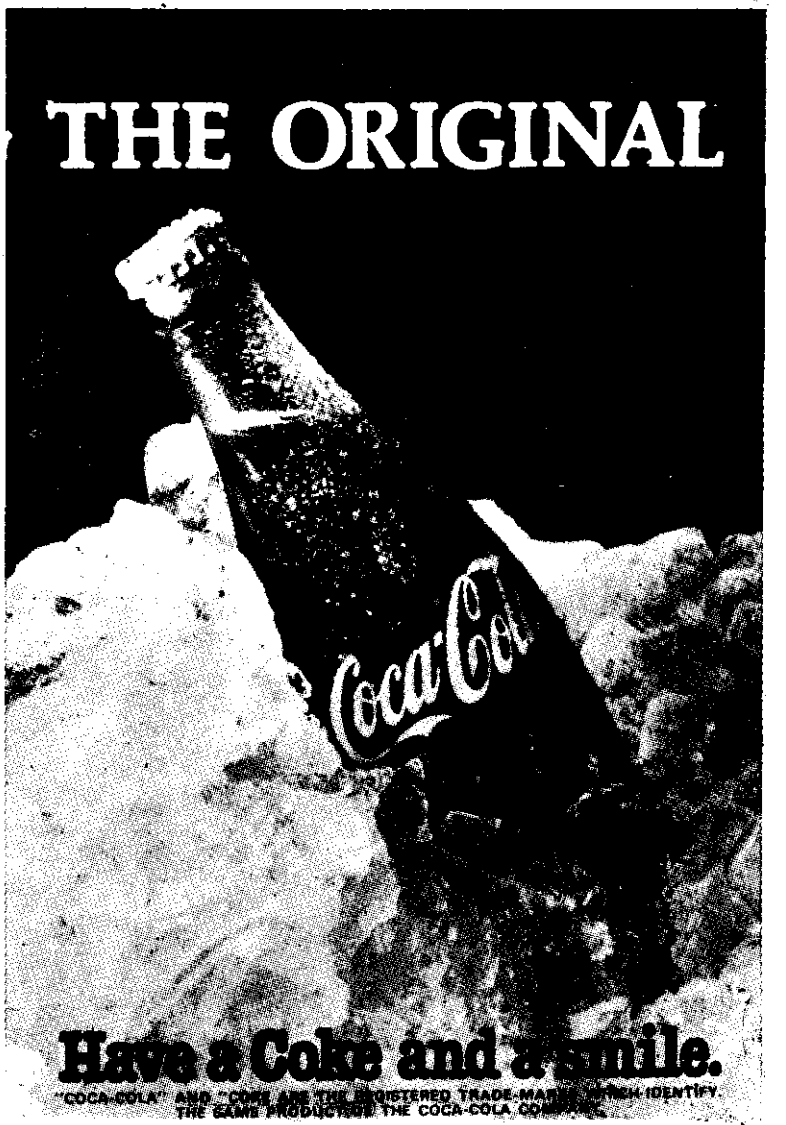
THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and a smile.
"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY
THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY
paragon

آپ کو پریسٹرلیسڈ کنکریٹ کے معیاری

گارڈر، بلے اور سلیب وغیرہ

درکار ہوں تو وہاں تشریف لے جائیے جہاں

اظہار لمیٹڈ کی تیار چھتیں

کا بورڈ نظر آئے

- صدر دفتر : ۶ - کوثر روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور
  فون:- ۶۹۵۲۲ ۶۱۵۱۴
- پچیسواں کیلومیٹر - لاہور شیخوپورہ روڈ۔
- جی-ٹی روڈ کٹھالہ (نزد ریلوے پھاٹک) گجرات
- پچیسواں کلومیٹر شیخوپورہ روڈ۔ فیصل آباد۔
- فیروز پور روڈ۔ نزد جامعہ اشرفیہ۔ لاہور۔ فون:- ۴۱۳۵۶۹
- شیخوپورہ روڈ۔ نزد نیشنل ہوزری فیصل آباد۔ فون:- ۵۰۶۲۶
- جی-ٹی روڈ۔ مریدکے۔ فون : ۷۰۰۳۸۹
- جی-ٹی روڈ۔ سرائے عالمگیر
- جی-ٹی رود۔ سواں کیمپ۔ راولپنڈی۔ فون:- ۶۸۱۲۷
- ڈی-۸۷۶ فرید ٹاؤن ساہیوال۔ فون :- ۳۳۸۲

جاری کردہ: مختار سنز گروپ آف کمپنیز

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱
۲۳۹۳۱

پاکستانی خواتین کے ایک مقبول اور کثیرالاشاعت ماہنامہ

آنچل کراچی

میں شائع شدہ

ڈاکٹر اسرار احمد

کا انٹرویو

اوائل ۸۳ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن پاکستان کے اجلاس منعقدہ خالقدینا ہال کراچی میں خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اجلاس کے اختتام پر ایسوسی ایشن کے صدر جناب ڈاکٹر مبین اختر صاحب ڈاکٹر صاحب کو اپنے کلینک واقع نارتھ ناظم آباد لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ وہاں ایسوسی ایشن کے مندوبین ہونگے، ان سے گفتگو ہوگی لیکن اس کے برعکس وہاں ماہنامہ 'آنچل' کراچی کی مدیرہ اور ایک اور خاتون منتظر تھیں اور اچانک یہ راز کھلا کہ یہاں انٹرویو کا اہتمام ہے۔ اجلاس کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مدیرۂ 'آنچل' کی جانب سے انٹرویو کی فرمائش پر مشتمل رقعہ تو ملا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لئے اس طور سے فوری 'سازش' ہو جائے گی۔ بہرحال وہاں کچھ گفتگو ہوئی ـــــ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ذہن سے یہ واقعہ بالکل محو ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اچانک ستمبر ۸۳ء میں ڈاکٹر صاحب کراچی گئے تو ایک صاحب نے نہایت تحسین آمیز انداز میں اس انٹرویو کا ذکر کیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فوراً تو بالکل انکار کر دیا کہ میں نے خواتین کے کسی جریدے کو انٹرویو نہیں دیا۔ پھر اچانک انہیں وہ واقعہ یاد آ گیا تو خیال ہوا کہ پرچہ حاصل کر کے دیکھا جائے کہ کیا کچھ چھاپ دیا گیا ہے ـــــ بلکہ اس پر حیرت بھی ہوئی کہ 'آنچل' والوں نے یہ کیا کیا کہ انٹرویو جولائی کی اشاعت میں چھپ گیا لیکن ہمیں خبر تک نہیں دی ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے تو پانچ پرچے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دیئے تھے لیکن غالباً محکمہ ڈاک کے کارکنوں کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پسند آ گئے ـــــ بہرحال انہوں نے دوبارہ پرچہ عنایت کیا تو یہ انٹرویو سامنے آیا جسے قارئین 'میثاق' کی دلچسپی کیلئے شائع کیا جا رہا ہے۔

(جمیل الرحمٰن)

فاطمہ زہرا جبین

اس ماہ کی شخصیت

ڈاکٹر اسرار احمد

دل موہ لینے والا مسحور کن انداز بیان، تقدس مآب چہرہ، دانش مندانہ پُروقار پیشانی، بردباری اور آہستہ آہستہ آدمی سے سچائی منوانے کی صلاحیت... یہ ہیں وہ اوصاف جو ٹی. وی پروگرام "الہدیٰ" کو دیکھتے ہوئے میرے ساتھ لاکھوں لوگوں نے محسوس کئے ہوں گے.

پاکستان بہترین عالم دین حضرات کا گہوارہ ہے اور ہم بے حساب علماء کرام کے ذریعے آفاقی علم حاصل کرتے ہیں لیکن انداز بیاں کی انفرادیت اور آواز کی گھن گرج کے ساتھ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ہے، تقویٰ... جس کی مثال فی زمانہ مشکل ہی سے ملے گی... میں نے سوچا، اس شخص کے تقوے کی مثال کیسے دوں جو آج کے ترقی پسند

دَور میں، اوصافِ پیغمبری کے اتباع پر منحصر ہے۔ جب کہ لوگوں کا خیال ہے کہ اس جدید سائنسی دَور میں چودہ سو سال پیچھے سفر کرنا ممکن نہیں ... اتباعِ رسُول مشکل ہے۔ لوگ انہیں جو چاہیں کہہ لیں، جو چاہیں سمجھ لیں۔ میں اپنے طور پر یہ سمجھنے میں برحق ہوں کہ تقویٰ اختیار کرنا ہی وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ضامن ہے۔ متقی اللہ کی نظروں میں محبوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ، انہی لوگوں کو پسند کرتا ہے، جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے راہِ نجات پر گامزن ہوئے۔

ایک کوالیفائڈ ایلوپیتھک ڈاکٹر کا اس قدر تقویٰ کا پابند ہونا میرے لئے واقعی نہ صرف حیرت کا باعث تھا بلکہ مسرت کا بھی ... کہ منشائے ایزدی کا کامل اتباع کس قدر مشکل اَمر ہے۔

وقت بدلا ہُوا ہے۔ اقدار بدل چکی ہیں۔ رسم و رواج تبدیل ہو گئے ہیں۔ بڑے بڑے جید علماء اور راہبرانِ دین، اسلامی شعار کو اختیار کرتے ہُوئے وقت کی رفتار کو بہر حال ملحوظ رکھتے ہُوئے اپنے چلن کو حسبِ حال ڈھال لیتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کے مؤقف کو اسی حال میں جاری رکھنے پر مُصر ہیں، جس طرح قرآن حکیم کے ذریعے آنحضورؐ نے نافذ کیا۔ وہ دین میں کسی بھی پیوندکاری کے روادار نہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ دینِ اسلام اتنا مکمل اور فطری دین ہے کہ تا قیامت اس میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ تمام انسانی ضرورتیں وہ خود پوری کرتا ہے پھر کس تبدیلی کی گنجائش ہے۔ اس دین کو... اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے؟

محترم ڈاکٹر اسرار احمد، عورتوں کو تو کیا، مردوں کو بھی انٹرویو نہیں دیتے۔ عجیب مایوس کن اور حوصلہ شکن صورتِ حال تھی اور میں نے اس صورتِ حال کو اپنی آئندہ میں ڈھالنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔

مدیرۂ آنچل سے گفتگو کے ایک طویل مرحلے سے گزرنے کے بعد میں نے واقعی اس چیلنج کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک تقریب میں بطورِ خاص شرکت کرنے کے لئے، میں خالقدینا ہال میں صبح نو بجے سے موجود تھی۔ میں اپنی کوتاہی سے کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہُوا کہ بعد نمازِ مغرب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قبلہ کی تشریف آوری متوقع ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد، میں نے ایک خط اُن کے نام تحریر کیا جس کا متن حسبِ ذیل ہے اور قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

محترم ڈاکٹر صاحب قبلہ!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

میں خواتین کے رسالے ماہنامہ آنچل کی طرف سے آپ کا انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔ رسالہ اگرچہ تفریحی ادب کا سرچشمہ ہے، تاہم دینی مسائل پر انتہائی مستند خدمات کی انجام دہی میں کسی قسم کے تساہل اور کوتاہی سے کام نہیں لیتا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے انٹرویو دینے سے انکار نہیں کریں گے کیونکہ لازمی اَمر ہے کہ اسلام کے اسکالروں کے انٹرویو شانِ جہاد کے ساتھ، دین کو بہتر طریقے پر قارئین کے آگے پیش کرے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ لوگ، آپ جیسے لوگوں سے واقف ہو سکیں۔ دین کی رہنمائی کے لئے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خواتین دین کے سلسلے میں راہبری کی جستجو میں حاضرِ خدمت ہُوا کرتی تھیں تو دستکاری نہ جاتی تھیں۔ قوم کی لاکھوں بیٹیاں آپ کے علم کی برکتوں سے مستفیض ہونا چاہتی ہیں... کیا آپ، انہیں مایوس کر دیں گے؟

کمترین فاطمہ زہرا جبین
نمائندہ ماہنامہ آنچل، کراچی

ڈاکٹر اسرار احمد نے میرا خط، اسٹیج ہی پر کھول لیا۔ اُن کے لبوں پر ایک پُرنور سی مُسکراہٹ رینگ گئی... اور میں، اُمید و بیم کے درمیان ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند، اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پروگرام کے اختتام کے بعد جب انہوں نے میری طرف توجہ فرمائی تو میں نے مرعوب ہوتے ہُوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

"انٹرویو سے مجھے انکار نہیں لیکن صبح آٹھ بجے، مجھے واپس بھی جانا ہے۔" انہوں نے پُر اخلاق انداز میں معذرت چاہی۔

میں نے ایس۔ اے خان اور ڈاکٹر سید مبین اختر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر مبین اختر نے بروقت میری اخلاقی مدد کرتے ہُوئے کہا۔

"ہم، ڈی۔ آئی۔ پی ہاؤس چلتے ہیں۔ آپ وہیں انٹرویو کر لیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی مقدس شخصیت کی جو دھاک دل پر بیٹھ چکی تھی، اُس نے اب اعتماد کی شکل اختیار کر لی تھی۔

رات گہرائی میں اتر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ سفر، کچھ عُمر اور کچھ شدتِ خطابت کے باعث تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ تاہم اُن کی روشن آنکھوں کی طرف دیکھ کر انسان مسحور ہُوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں، انٹرویو حاصل ہونے کی مسرت اور طمانیت سے کچھ نفسیاتی طور پر متاثر و مرعوب ہو کر سوال کرنے لگی۔

"آپ موجودہ دَور میں نفاذِ اسلام کے منصوبے اور اس پر عمل درآمد سے مطمئن ہیں؟"

"قطعاً نہیں۔" وہ اعتراف کے معاملے میں بے باک اور مکمل طور پر راست گو تھے۔

"کیوں... کوئی وجہ، کوئی خامی؟"

"نفاذِ اسلام کی رفتار اس قدر مدھم اور خطوط اس قدر موہوم ہیں کہ اگر واقعی اس کی برکات، معاشرے پر اثر پذیر ہو چکی ہیں تو اُ...

کا واضح اور مکمل ظہور نہیں پایا جاتا۔ اسی وجہ سے لوگوں میں مایوسی اور کم حوصلگی پائی جاتی ہے۔ موجودہ حکومت، نفاذِ اسلام کے معاملے میں انتہائی سست روی سے کام کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ دین کے نفاذ کے سلسلے میں بھی انہوں نے اپنی ترجیحات رکھی ہیں اور یہ ترجیحات دین سے ہرگز ہرگز مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً یہ کہ جنسی جرائم کی جو سزا وہ دیتے ہیں ان میں احکامِ دین اور قرآن کے مطابق ستر اور حجاب کے جو احکام ہیں ان پر قطعی عمل نہیں ہوتا۔ بتدریج ہی سہی، نافذ تو کریں۔ دین کے احکامات پر مکمل طور پر عمل در آمد خواہ وہ تدریجی ... طریق کار ہو یا انقلابی عمل کے ذریعے، دینِ مبین کی آفاقی حیثیت کے نفوذ کا واحد ذریعہ ہے ... اور اب جب کہ عمل در آمد ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ وقت کا بڑا حصہ صرف دستاویزی تیاریوں وغیرہ میں صرف ہو رہا ہے تو امر لازم ہے کہ اس رفتار سے سفر کی منزلوں کا یقین انتہائی مایوس کن ہوگا۔"

"کیا آپ کے خیال میں دین کو مکمل طور پر یک لخت نافذ کرنا چاہیئے؟"

"جی ہاں۔ یک لخت اور آناً فاناً ... کیونکہ اسلام کو نافذ کرنے کے لئے 'جزو' کے فلسفے سے 'کل' کا فلسفہ زیادہ موثر اور مستحکم ہے۔ اور انقلاب ہی وہ لفظ ہے جو اس کے عمل کو بیان کر سکتا ہے۔ یعنی انقلابی خصوصیت کے حامل لوگ، انقلابی جماعت بنائیں ... اور انقلاب کی راہ ہموار کر کے غیر اسلامی شعائر کو یک لخت منسوخ کریں۔ یہ وہ لوگ ہوں جو بنیادی طور پر تربیت شدہ ہوں۔ جنہوں نے اسلام کی خاطر قربانیاں دے کر اپنے آپ کو ثابت کیا ہو۔ جب تک محنتِ شاقہ سے ایسے لوگ فراہم نہ ہوں گے جو دین کی آفاقی حیثیت پر ناقابلِ شکست اعتماد رکھتے ہوں اور اس کے نفاذ میں کسی مزاحمت کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ ایک انقلابی جماعت کا وجود میں آنا کیا معنی خیز نہیں؟"

"نفاذِ اسلام کے لئے کیا اسلام کو زمانے اور وقت کے ارتقائی مدارج کا تابع رکھنا بہتر ہے یا زمانے کو اسلام کے اتباع سے ... مشروط رکھنا ہوگا؟"

"اصل میں تو ہمیں زمانے کو دین کے تابع کرنا ہے۔ دین کو وقت کے پیمانے میں اتارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی تمام تر مادی اور روحانی افادیت کی کماحقہ معنویت کے ساتھ نافذ کیا گیا ہے۔ ارتقاء دراصل کائنات کے علم کے حصول اور حصول کے ذریعے زندگی کے معیار اور حصولِ آگہی کے معیار کا بتدریج اضافہ ہے۔ اس اضافے کے لئے لباس، طرزِ معاشرت ... طرزِ بود و باش، عقیدے یا یقین میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی البتہ ایک عنصر 'اجتہاد' کا ہے۔ وہ چونکہ دین کے اندر ہے، دین سے باہر نہیں لہٰذا میں اس کو یوں نہیں کہوں گا کہ ہم نے زمانے کے مطابق دین کو کیا ہے بلکہ دین تو اپنی جگہ پر صدیوں سے قائم ہے۔ ہمیں اس کو نافذ کرنا ہے، حاکم بنانا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! بسا اوقات لوگ آپ کو انتہا پسند قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ واقعی انتہا پسند ہیں؟"

"دراصل مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ لوگ مجھے انتہا پسند سمجھتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ کس انداز میں مجھے انتہا پسند قرار دیتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں خود کو FUNDAMENTALIST کہلائے جانے پر اعتراض نہ کروں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے جو FUNDAMENTALS ہیں ان پر میں کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں دین کو مکمل سمجھتا ہوں۔ اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ دین کو وقت کے لحاظ سے تبدیل کئے بغیر بھی انسان ارتقاء کے اعلیٰ ترین مدارج طے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ لوگ ... مجھے انتہا پسند سمجھتے ہوں کیونکہ میں دین پر تصرف کرنے میں ایسا کوئی سودا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے انتہا پسند کن معنوں میں کہا جاتا ہے، اس کا مجھے کوئی جواز ہی نظر نہیں آتا۔"

"اگر آدمی اپنی ذات کی حد تک مضبوط کردار کا حامل ہو تو انتہا پسند ہو جاتا ہے۔ تاہم کیا مذہب کے سلسلے میں تمام معاشرے کو انتہا پسند بنایا جا سکتا ہے۔ یعنی کسی بھی چیز کا نفاذ جس پر طبیعت مکمل طور پر تربیت یافتہ نہ ہو؟"

"دراصل اسلام کا نفاذ ہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ اس کے لئے جدوجہد اہم ترین منصب ہے۔ جدوجہد کے ذریعے ہی لوگوں کو قائل کر کے آمادہ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ان کے تعاون سے ایک جماعت تشکیل کرنی ہوگی۔ جب لوگ قائل ہو جائیں گے تو کوئی امر انہیں اپنے اندر زبردست انقلاب پیدا کرنے سے نہیں روک سکے گا لیکن یہ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آج میرے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے تو میں اسلام کو نافذ کر دوں۔ واقعتہً جب تک ہم انقلابی عمل سے نہ گزریں گے، اسلام کی تنفیذ یا اسلام کا غلبہ ممکنات میں سے نہیں۔"

"تو کیا یہی وجہ ہے کہ ہم ہنوز اسلام کے نفاذ کے راستے تلاش کر رہے ہیں تاکہ مستقبل کے کسی دور میں تدریجی بنیادوں پر نافذ کیا جا سکے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں ..." مختصر سا جواب تھا۔

کافی عرصے سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خواتین کے سلسلے میں موقف پر خبریں چھپ رہی تھیں۔ اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ "میں کسی تنازعے کے لئے نہیں ہوں"۔ تاہم ان کی ذات و شخصیت متنازعہ تھی ... یا پھر لفظ تنازعہ کو ایک نیا موضوع مل گیا۔ خواہ مطلب کچھ بھی ہو۔ چونکہ مجھے ان موضوعات کے موضوع پر تشفی کے لئے معلومات درکار تھیں لہٰذا میں نے پوچھا۔

"دینی لحاظ سے خواتین کی تربیت کن خطوط پر ہونی چاہیئے... کہ عورت احساس حق تلفی اور محرومی کے بغیر اعتماد کے ساتھ معاشرے کا ایک فعال حصہ مقرر ہو جائے اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت جس عقیدے کے درمیان پل کر جوان ہوتی ہے، دمِ آخر تک اسی پر سختی سے قائم رہتی ہے۔ اس سلسلے میں عورت سے تبلیغ کی ابتداء کے بارے میں بحث فرمائیے۔"

"تبلیغ کے بارے میں مرد اور عورت یکساں ہیں۔ یعنی جب بھی کسی معاشرے میں کسی بھی خیال کے تحت تبلیغ کی ابتدا ہوتی ہے تو وہ خواتین اور مردوں پر یکساں انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ یکساں انداز ہی میں اسے قبول کیا جاتا ہے لیکن عورت کو بہترین تربیت اور بہترین کارکردگی کی مراعات ملنا چاہئیں کیونکہ اگلی نسل اُس کی گود میں پلتی ہے لیکن انقلاب کی ابتدا میں سب سے بڑا کردار مردوں کا ہوتا ہے۔ تاہم ہر دو صورتوں میں کسی بھی اہمیت کا یقین بہ آسانی نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر اہم اور مضبوط ستون کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔ البتہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی جسمانی اور نفسیاتی ساخت میں فرق کا تعین کر دیا ہے۔ اس تعین کی مقرر کردہ حد میں ذہنی، روحانی اور اخلاقی حصار کے ساتھ اُنہیں تعلیم و تربیت کے مکمل مواقع فراہم ہونا چاہئیں۔ غلط تعلیم کے ذریعے ایک بڑا الجھاؤ وجود میں آتا ہے۔ جو اپنی تباہ کاریوں کے ذریعے ہماری بہترین صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم یکسر غیر مؤثر... اور بے معنی ہے؟"

"ہاں، اکثر و بیشتر۔ میرے خیال میں لڑکیوں کے لئے ادب، فلسفہ، سائیکلوجی، ایسے علوم ہیں جن سے بہترین نسلوں کو وجود میں لانا ممکن ہے۔ ایسے علوم جن سے اُن کے اندر شعُور پیدا ہو۔ جن سے تربیت اولاد کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ انسانی نفسیات کا فہم ہو، امورِ خانہ داری کی عملی تربیت کا مظاہرہ ہو۔ میڈیکل لائن میں خواتین کے ذریعے پردے میں خواتین کے عوارض کے علاج کی مکمل ترین سہولتوں کا اہتمام ہو تاکہ عورتوں کا علاج معالجہ عورتیں ہی کر سکیں۔ سوائے اس کے کہ بہت ہی پیچیدہ معاملہ ہو تو مردوں کے پاس جائے۔ ورنہ اس سلسلے میں مردوں کی حوصلہ شکنی ہونا چاہیئے۔"

"درس و تدریس کے شعبے میں بھی خواتین کا حق ہو سکتا ہے؟"

"جی ہاں، بے شک... کیونکہ خواتین کا خواتین کے لئے علیحدہ شعبۂ تعلیم قائم کرنا ازحد ضروری ہے تاکہ پردے کی عظمتوں کے ساتھ علم، مثالی معراجِ کمال سے خواتین میں منتقل ہو جائے۔"

"کیا عورت اتالیق کی حیثیت سے مرد سے بہتر کام کر سکتی ہے؟ اور پرائمری لیول تک صرف عورتوں کو اُستاد مقرر کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں، لڑکے ہوں یا لڑکیاں TENDER AGE میں ماں کی شفقتوں کی طرف رغبت رکھتے ہیں اس بنیادی حقیقت کے سبب اگر خواتین پرائمری لیول تک جہاں بچے [illegible] کے منتظر ہوتے ہیں... خواتین اساتذہ اپنی محبتوں سے [illegible] سے بہترین نتائج برآمد کر سکتی ہیں۔ اس لیول کے بعد لڑکوں کے لئے مرد اور لڑکیوں کے لئے صرف خواتین اساتذہ کے شعبوں کا منتقل کر دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح دین... کی پابندی کے ساتھ معیاری کردار بھی حاصل ہو سکتا ہے۔"

"ملازمتوں کے شعبے علیحدہ کرنے کے بعد خواتین کو زیادہ فعال کردار دینا ناانصافی تو نہیں؟"

"موجودہ دَور، تقابل کا دَور ہے۔ نوعِ انسانی کا تناسب زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو اصولی طور پر کفالت کی ذمّے داری مرد کی ہے لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر مرد اس ذمّے داری کو نبھانے سے معذور ہے اور اگر مُلکی معیشت میں بھی ضرورت ہو تو ہم اپنی پیداوار میں خواتین سے مدد لیں کیونکہ اس وقت دُنیا ایک معاشی مقابلے میں بُری طرح مُبتلا ہے تو اس صُورت میں اسلام کے دائرے میں رہتے ہُوئے متبادل صورتِ حال... فراہم کرنا ہوگی۔"

"یعنی...؟" میں نے پُوچھا۔

"یعنی محلّہ در محلّہ، کاٹن انڈسٹریز سے خام مال گھروں پر پہنچایا جائے۔ جہاں عورتیں کام کریں اور شام کو فوری ادائیگی کے بعد... مال واپس لیا جائے۔ اس قسم کا باقاعدہ نظام مربوط طریقے سے ذرا سی جہد سے قائم ہو سکتا ہے۔ ایسے انڈسٹریل یونٹ بنائے جائیں جن میں عورتیں کام کریں اور عورتیں ہی کام لیں۔ خواتین کی جسمانی ساخت اور مصروفیات نجی کے لحاظ سے SHORT SHIFT بنیاد پر انہیں ملازم رکھا جائے۔ یہ شفٹ چار گھنٹے کی ہو... اور یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب رجائیت پسند، قیادت نہیں بلکہ مذہبی قیادت برسرِ اقتدار آئے، جس کا اپنا ایک مکمل نظریہ ہو کہ ہر حالت میں دین کی پابندی کرنا ہے اس کے ساتھ چلنا ہے تو یہ سارے کام بہ احسن و خوبی انجام پا سکیں گے لیکن جب ان چیزوں کو صرف ظاہری نگاہ سے پرکھا جائے گا تو یہ سب کام پہاڑ معلوم ہوں گے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا۔

"اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کا اصل مقام اُس کا گھر اور نسلوں کی پرورش و پرداخت ہے۔ عام حالات میں ایک عورت، اوّل تا آخر ایک خاندار عزّت مآب بیوی، ماں، بہن اور بیٹی ہے... تاہم بوقتِ ضرورت اسے زندگی کی ہر جہد میں مسابقت کا حق حاصل ہے مگر حدود کے ساتھ۔"

"صحافی اور دانشور حضرات تجسس میں ہیں کہ آپ عورت کو کس طرح رکھنے پر یقین رکھتے ہیں، کیا کبھی آپ نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ اپنی خواتین کو کس طریقے پر رکھتے ہیں؟"

"میرا اُن حضرات سے براہِ راست کبھی رابطہ نہیں رہا۔ روزنامہ

جنگ میں ارشاد احمد حقانی کام کرتے ہیں۔ وہ میرے پاس آئے تو میں یہ نہیں سمجھا کہ وہ میرے پاس انٹرویو کی غرض سے آئے ہیں۔ وہ ہمارے پرانے ہم جماعتوں میں سے ہیں۔ جب انہوں نے مجھ سے وقت مانگا تو میں سمجھا کہ پرانی ملاقات کی تجدید کے لئے یا پھر ایسی ہی کسی ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ وہ صحافی کی حیثیت سے مجھ سے انٹرویو لے گئے۔ کچھ سوالات آخر میں سرعت سے یکے بعد دیگرے ہو گئے۔ اس میں بعض باتیں خالص تصوراتی طرز کی تھیں جیسے آج آپ کے ہاتھ میں طاقت آجائے تو آپ کیا کریں گے؟ تو میں نے کہا، سب کو پنشن پر بھیج دوں۔ خاص طور پر خواتین کو۔ ظاہری بات ہے، پنشن پر بھیج رہا ہوں، ڈِس مِس تو نہیں کر رہا ہوں۔ پنشن مل جائے اور کیا چاہئے، گھر بیٹھیں۔ بہرحال مجھے اس بات کا اندازہ نہیں کیونکہ میرا صحافیوں سے زیادہ تعلق نہیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں؟ ان کے گھریلو حالات کیسے ہیں؟"

"ایک کثیرالاشاعت روزنامے میں عورت کے مقام کے عنوان سے کچھ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، عورت جو کہے، اس کے خلاف کرو۔ اس میں بڑی برکت ہے؛ جب کہ ہمارے نبی کریمؐ اگر عورت کے بارے میں ایسی رائے رکھتے... تو بی بی عائشہ صدیقہؓ سے مشاورت کا جواز باقی نہ رہتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی بات ہو بھی... اور چونکہ یہ مضامین میرے مطالعے سے نہیں گزرے، لہٰذا میں اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"آپ اور بہت سے حضرات خواتین کے لباس کے بارے میں خاصے متفکر پائے جاتے ہیں اور یہ درست بھی ہے۔ تاہم آپ نے کبھی مردوں کی چست پتلونوں کو دیکھا ہے جو ٹی شرٹ، جرسی اور بنیانوں پر پہنی ہوتی ہیں۔ کیا مردانگی اور برہنگی دورِ جدید کی توام بہنیں تو نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے میرے سوال کو تحمل سے سنا اور فرمایا۔

"ستر پوشی ہر دو اصناف پر لازم ہے تاکہ معاشرہ، پاکیزہ حیثیت کو برقرار رکھ سکے۔ آپ کی بات صحیح ہے۔ ساتر لباس مرد کا بھی ہونا... چاہیئے۔ مرد کے لئے ستر کی حد، ناف سے اوپر سے لے کر گھٹنوں کے نیچے تک ہے لیکن عورت کے لئے سوائے چہرے کی ٹکیہ، ہاتھ اور پاؤں کے علاوہ تمام اعضا کا پوشیدہ رکھنا شرعاً فرض ہے۔ مرد اور عورت میں نفسیاتی اعتبار سے ایک فرق ہے۔ جسمانی لحاظ سے عورت کے لئے مرد میں کشش ہے اور مرد کے لئے عورت میں... لیکن نفسیاتی فرق یہ ہے کہ مرد قوی تر ہے اور اقدام اور فعالیت میں فزوں تر، اس میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے۔ عورت میں نفسیاتی طور پر گریز ہے، فطری گریز ہے اور یہی اس کی نسوانیت کا اصل زیور ہے۔ لہٰذا عورت، مرد کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود فطری طور پر اقدام حصول میں اتنی شدید نہیں جتنا کہ مرد ہے۔ اس اعتبار سے عورتوں کا مردوں کو دیکھنا اتنا اشتعال انگیز نہیں ہے جتنا مردوں کا عورتوں کو دیکھنا۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مرد بھی پردہ کریں۔ نہ عورتیں مردوں کو دیکھیں نہ مرد، عورتوں کو... لیکن یہ بات نہیں ہے۔ صرف عورت کو پردے کا پابند کیا گیا ہے، جسم کا بیشتر حصہ چھپانا لازمی قرار دیا گیا ہے لیکن مرد کے لئے اس قدر پابندی نہیں... مثلاً مرد کا ستر، ناف کے اوپر سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ہے۔ اگر جسم کا حصہ ڈھکا ہوا ہے تو غنیمت ہے۔ اگر اس نے قمیص نہیں پہنی ہے تو اس پر لازم بھی نہیں۔ تاہم عورت کا پورا جسم ستر ہے۔ سوائے چہرے کے اور ہاتھ، پیر کے لیکن آج کل مرد جو چست لباس پہنتے ہیں، وہ درست نہیں ہے۔ خاص طور پر نیکر۔ کھیلوں میں شارٹس کا استعمال، تیراکی کا لباس، شریعت کے سراسر خلاف ہے۔ مرد کو ناف سے اوپر اور گھٹنے سے نیچے تک جسم کو کپڑے سے پوشیدہ رکھنا ضروری اور شرعی ہے۔"

"مذہب معاشرے میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟"

"آپ کا انٹرویو ہنوز ختم نہیں ہوا؟" ڈاکٹر صاحب نے پہلو بدلا۔

"دیکھئے، محترم ڈاکٹر صاحب! سوال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاری، آپ کے علم کے ایک ایک لفظ کو وضاحت کے ساتھ سن لیں، سمجھ لیں اور توفیق ہو تو عمل بھی کریں، اس لئے گستاخی معاف۔"

وہ شفقت سے بولے۔

"معاشرے میں مذہب وہی کردار ادا کرتا ہے جو ایک فرد کی زندگی میں۔ مذہب اخلاق کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو گی کہ معاشرہ نفس حیوان کی بربریت سے صرف اور صرف دین کی وجہ سے پاک ہو گا۔ انسان، انسان کا حق، اس کے طلب کرنے سے پہلے ادا کر دے گا۔ یہ ایک بہت عظیم تربیت کی بات ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عجلت کا تصور، کردار کے اعلیٰ ترین تصور کی ضمانت ہو گا۔ اور یہ ضمانت صرف دین کا احیاء ہی دے سکتا ہے۔ مذہب معاشرے میں رہنے والوں اور معاشرے کو جزا اور سزا کا تصور دیتا ہے۔ خود احتسابی کا قانون دیتا ہے، جس سے انسان خود اپنے طرزِ عمل پر ناقدانہ احتساب قائم کرتا ہے۔ مذہب کے جو اثرات انفرادی طور پر فرد پر مرتب ہوتے ہیں، وہی اجتماعی طور پر... معاشرے پر ہوں گے۔ ہمارا جو مذہب ہے، وہ مذہب نہیں دین ہے۔ بلکہ دین کے بارے میں میں کہوں گا کہ THIS IS A WAY OF LIFE, RATHER A SYSTEM OF LIFE. جس میں اس کا معاشی، سیاسی، سماجی ایک مکمل نظام پنہاں ہے۔ ان کے درمیان عدل وانصاف، اعتدال و توازن ہے جو انسان کی بنیادی ضرورت ہے کہ ہر انسان ہر طرح کی اونچ نیچ، ہر طرح کی افراط و تفریط سے بچ کر رہے۔ انسان کو دین کی صورت میں جو متوازی نظام ملا ہے۔ وہ درحقیقت اسلام کا نوعِ انسانی پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔"

"جہاد کے بارے میں فرمایئے؟"

"جہاد کے تین حصے ہیں۔ ایک اپنے نفس حیوان کی بربریت کے خلاف جہاد یعنی اپنے نفس کو ممکنہ حد تک برائیوں سے پاک کرنے کا مرحلہ۔ جب تک انسان خود شر، برائی اور حرام خوری سے نہ

بچے گا، وہ کوئی جہاد نہ کر سکے گا۔ یہ وہ MOST FUNDAMENTEL جہاد ہے جہاں انسان اپنی ذات سے آگاہ ہوتے ہوئے مشرف آدمیت کے حصول کے لیے حیوانی محرکات کو قابو کرتا ہوا نفسِ حیوان کو مکمل طور پر زیر کرنے کے اہل ہو جاتا ہے۔

دوسرا جہاد ہے معاشرے میں توہمات یا باطل نظریات متصادم اور متضاد مکاتب فکر میں اصلاح حال و احوال، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترویج میں نقائص کو قطع کرنا یعنی اسلامی معاشرے کو عین اسلام کے مطابق رواج دینے کے لئے ہر فرد کا انفرادی جہاد ایک اجتماعی کیفیت کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین بے مثال قوم کی صورت میں وجود پاتا ہے۔ تیسرا جہاد وہ ہے جو ان اقوام کے ساتھ ہے جو اس عظیم المرتب منصوبے کو خاک میں ملا کر اپنے عقائد کی برتری کے ذریعے اپنے اقتدار کے ذریعے نوعِ آدم کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کی یعنی حق کا باطل کے ساتھ مقابلہ۔ یہ آخری اسٹیج ہے جس میں جان کی بازی بھی لگتی ہے۔"

"علماء کی سطح سے صرف تقریریں ہی جہاد ہیں۔ ایسے بے عمل عالموں سے ہم کن تاریخی فتوحات کی امید رکھ سکتے ہیں؟" میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا لیکن انہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہمیں دوسروں سے بہت سی امیدیں وابستہ نہیں رکھنا چاہئیں بلکہ خود بڑھ کر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہی غنیمت ہے۔ ایسے ماحول میں بہت کچھ حاصل ہونا امرِ محال ہے۔ تاہم ایک رمق شرر فشانی اس خس و خاشاک میں رہ گئی ہے۔ اس میں علماء کا بہت بڑا CONTRIBUTION ہے۔ انہوں نے مسجدیں آباد رکھی ہوئی ہیں، اذانیں ہیں، نمازیں ہیں، سجدے ہیں، خطبے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ معاشرہ ان کا مثبت حصہ ہے۔۔ پھر میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ہم سب لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ سارا کام وہی کریں۔ ہمیں بھی تو خود بحیثیت مسلمان کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اپنے اعمال و کوتاہی کی اللہ تعالیٰ کے سامنے وہی جواب دیں گے اور اسلام میں یہ کام صرف علماء کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔"

"بچے کو بہترین اسلامی لٹریچر پڑھایا جائے۔ بہترین اسلامی تربیت دی جائے اور بہترین شخصیت کے ساتھ پیش کیا جائے اور ہر گھر میں یہی جذبہ پروان چڑھے تو کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ موجودہ منافقت کا دور ہٹے اور اسلام جلد از جلد اپنی تمام افادیت کے ساتھ نافذ ہو جائے۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ بولے۔

"جی ہاں۔ میں نے پہلے ہی کہا نا کہ جہاد کی ابتدا تو خود انسان کے اپنے نفس سے ہوتی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب، بلاسود بینکاری کے سلسلے میں کیا ہم پوری طرح اسلام پر کاربند ہیں؟"

"دراصل، میں اس نظام کو ہنوز اسٹڈی نہیں کر سکا ہوں جو کہ نافذ کیا گیا ہے۔" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جواب دیا۔ "جہاں تک ہماری معلومات حاصل کرنے کی بات ہے تو اس بارے میں یہی معلوم ہوا ہے کہ حکومت 'بلاسود بینکاری' کا سارا روپیہ صرف اجناس کی خریداری پر صرف کر رہی ہے۔ اس میں مارکر سسٹم بھی استعمال ہو رہا ہے۔ تاہم ایک بات میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ نظام اپنی روح کے اعتبار سے سودی ہی ہے۔"

"جی ہاں، بلاسود بینکاری نظام ہنوز متنازعہ مسئلہ ہے لیکن شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"شریعت تو سود کو حرام قرار دیتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی آواز کھلا جہاد تھی، لہجہ، تلوار کی سان تھا۔۔۔ اور سوال یہ تھا کہ شب بطل میں 'جہاد' کی یہ للکار کہاں تک پہنچے گی؟

انہوں نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ کوئی شخص جو اس سسٹم آف بینکنگ پر عبور رکھتا ہو وہی اس کی صحیح تشریح کر سکتا ہے۔ البتہ میرے نزدیک ایک آدمی، حکومت کی اس یقین دہانی پر کہ یہ سودی نہیں اس میں روپیہ جمع کرائے گا اور اسے کچھ نہ معلوم ہو گا۔ انشاءاللہ! وہ گنہگار نہ ہو گا۔ اس کے گناہ کا پورا وزن حکومت کے کریڈٹ کارڈ میں درج ہو گا۔"

"اگر اس کو معلوم ہو جائے تو؟" ڈاکٹر مبین اختر ماہرِ نفسیات نے سوال کیا۔

"تو وہ گنہگار ہو گا۔" ڈاکٹر اسرار احمد نے مختصراً جواب دیا۔

"جو لوگ بینکنگ نظام میں اپنے فرائض، ملازمین کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں، ان کے مشاہروں کے بارے میں متضاد رائے پائی جاتی ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟"

"غیر سودی کمائی تو اب کھلا ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "پہلے تو یہ نظام سو فی صد سود پر تھا۔ تب بھی لوگ ملازمت کر رہے تھے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے تاجر ایسے ہیں جو اوور ڈرافٹ پر بزنس نہیں کرتے۔ کتنے کاروباری لوگ ایسے ہیں جو سود نہیں لیتے۔ معاشرے میں تو حرام خوری رچ بس گئی ہے۔ کسی بھی ملک میں، جبکہ اس میں اپنا ایک ادارہ بھی ہو اور اس ادارے کا ایک DETERMINATION بھی ہو تو وہ ملکی نظام اختیار کرتا ہے۔ دُنیا اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لیتی ہے۔ دُنیا ہمارے ساتھ بزنس کرتی ہے تو اپنی غرض سے کرتی ہے۔ صرف ہمارے فائدے کے لئے نہیں کرتی۔ کوئی ملک ہمیں سود دیتا ہے تو اپنے مفاد کے لئے دیتا ہے۔۔۔ مگر جب ہم اپنا ایک مکمل نظامِ معیشت ترتیب دے لیں گے تو دُنیا صرف اپنی غرض کے لئے ہمارے ساتھ مذکورہ نظام کے تحت ہو گی تو کوئی دقت نہ رہے گی اور پھر جب ہماری تجارت کا رابطہ سودی معیشت پر چلنے والے ممالک سے رہے گا تو لامحالہ سود آہستہ آہستہ ہماری رگوں میں گردش کناں ہو جائے گا۔ آخر کمیونسٹ ممالک بھی تو ہیں جہاں سودی نظام نہیں تو وہاں سے بھی تو تجارت ہوتی ہے انہوں نے غیر محسوس طریقے پر اسلامی تصور اپنا لیا جبکہ ہمارا نظام اس سے

جاری ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"حصار، مشرقی پنجاب، جو اب ہریانہ میں ہے۔ وہیں میری پیدائش ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔" عجیب تقدس اور سادگی سے انہوں نے کہا۔ "۱۹۴۷ء میں میٹرک وہیں سے کیا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کرکے ہم مغربی پنجاب یعنی پاکستانی پنجاب میں آگئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء گورنمنٹ میڈیکل کالج لاہور سے ایف۔ ایس سی کیا۔ ایم۔ بی بی۔ ایس کے لئے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور منتخب کیا اور وہاں سے ۱۹۵۴ء میں فارغ التحصیل ہوا۔ ہائی اسکول لائف کے دوران میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ممبر تھا۔ دین سے غیر معمولی رغبت فطرتِ ثانیہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں سرگرم کارکن تھا۔ اپنے ضلعے کی آرگنائزیشن کا جنرل سیکریٹری تھا۔ کالج لائف میں میرا رابطہ فوری طور پر جماعتِ اسلامی کی جمعیتِ طلبہ سے ہوا۔ میری تعلیمی زندگی کے سات سال جمعیتِ طلبہ کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد میں نے جماعتِ اسلامی کی رکنیت اختیار کرلی تقریباً ڈھائی سال تک میں جماعت کا رکن رہا۔ ۱۹۵۶ء میں نے اپنا ایک مضمون لکھا جس میں مجھے جماعت کی پالیسی کے ساتھ اختلاف تھا۔ اس کی وجوہات عملی اور انتخابی سیاست میں جماعت کی غیر معمولی... مصروفیات تھیں، جس کی وجہ سے میرے خیال میں بنیادی کام میں رکاوٹ پیدا ہورہی تھی۔ مولانا مودودی صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں ہونی چاہیئے۔ اس وقت پارٹی میں بڑے بھاری اور سمجھدار لوگ شامل تھے۔ مثلاً مولانا اصلاحی صاحب۔ انجام کار ہم لوگ جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔ جماعت سے علیحدگی تھی، تحریک سے علیحدگی ہرگز نہ تھی۔ میری عمر اس وقت چھبیس برس تھی۔ میں جوان تھا اور انتظار میں تھا کہ بزرگ لوگ شاید تنظیم کی شکل اختیار کریں تو ان کے ساتھ ہم بھی منزلوں کا رختِ سفر باندھیں لیکن کچھ اسباب کی بنا پر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو پھر ۱۹۶۶ء کی ابتدا میں جب میں چونتیس برس کا تھا تو حوصلے مضبوط اور پختہ ہوچکے تھے... اور میں نے تہیہ کرلیا کہ مجھے خود کام کرنا چاہیئے تو پھر میں دوبارہ لاہور شفٹ ہوا... کیونکہ میں M.B.B.S کرکے ساہیوال آگیا تھا، جہاں میرے والدین تھے۔ لاہور منتقل ہوکر میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ میں نے قرآن مجید کے درس کے ذریعے بنیادی باتیں مثلاً دین اور دینی فرائض کے تصور پر کام کیا۔ تقریباً چھ برس تک تن تنہا کسی تنظیم کے بغیر میں لگاتار خلوص کے ساتھ کام کرتا رہا۔ میں نے اصلاحی صاحب کے ساتھ 'میثاق' جاری کیا جو میرے اپنے اشاعتی ادارے 'دارالاشاعتِ اسلامیہ' سے شائع ہوتا تھا جو بعد میں بند ہوگیا تھا۔ میری تنہا کوششیں تھیں کہ میثاق دوبارہ جاری ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں میں نے انجمن خدام القرآن قائم کی۔ میں اس کا بانی اور تاحیات صدر ہوں پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔ یہی میری مختصر سی سرگزشت ہے۔"

ڈاکٹر صاحب خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔

"آپ نے تنہا رہ کر بڑے حوصلے سے کام کیا ہوگا؟"

"جی ہاں، مجھے تنہا ہی بہت حوصلے اور فلک آسا امیدوں کے ساتھ اس عظیم مقصد کی خاطر منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے تیار ہونا پڑا۔"

"آپ نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد کتنے عرصے پریکٹس کی؟"

"سولہ سال..."

"تو اب آپ پریکٹس نہیں کررہے؟"

"۱۹۷۱ء سے میں نے یہ پریکٹس بند کردی ہے۔"

"اسلام، ڈاکٹری اور نفسیات میں کوئی مطابقت؟"

"انسان اپنے مادی جسم کے اندر ایک طویل سلسلہ ہے... نفسیاتی طور پر.. جذباتی کیفیات کا سرچشمہ ہے 'دماغ'۔ جب یہ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات جسم پر حاوی ہونے لگتی ہیں تو مینٹل پیتھالوجی کو جنم دیتی ہیں۔ یعنی فرسٹریشن، اضطراری کیفیت، خواہشات کی بہتات وغیرہ اور ان ذہنی ABNORMALITIES کے اثرات انسان کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان نفسیاتی کیفیات کو اعتدال میں رکھنے کے لئے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو ہم INTERNAL PEACE کہتے ہیں۔ یہ کیفیت انسان کی تمام جسمانی اور روحانی حیثیتوں کو مربوط رکھتے ہوئے اجتماعی طور پر ایک اور ہمہ گیر وصف کو جنم دیتی ہے جو SOCIAL PEACE ہے یعنی:-

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔ کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے اور یہ دونوں چیزیں درحقیقت ہمیں سب سے زیادہ اسلام سے ملتی ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ دوائیوں کو کم کرکے، اسلامی تعلیمات کے ذریعے مریض کا نفسیاتی طور پر علاج کیا جائے؟"

"ہاں، یہ ممکن ہے، عین ممکن... اس میں معالج کی قوتِ ارادی اور روحانی سطح کا معیار ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

میں مزید سوال کرنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے شفقت سے کہا۔

"بھئی، پرچہ ختم ہوا تو آپ زبانی سوالات پر اتر آئیں... میرے خیال میں، آپ کے سوالات کا سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔"

"جی ہاں، میں اس برکت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ بحیثیت ڈاکٹر، دینی خدمات کیونکر انجام دی جاسکتی ہیں...؟ کیونکہ آپ نے تو پریکٹس چھوڑ دی جب کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔"

"آپ اس مسئلے کو کچھ اس طرح سمجھئے کہ حضورؐ تاجر تھے لیکن آپ نے دین کے لئے مکمل طور پر تجارت چھوڑ دی۔ ایک بڑے مقصد یعنی ملک وملت کی راہبری کے لئے ایک چھوٹے مقصد کو اتباعِ رسولؐ میں ترک کرنا ہوتا ہے تاکہ یکسوئی کے ساتھ تمام تر توجہ سے منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ یعنی قومی سطح پر لیڈر بننا ہے تو اسے اپنا کام ترک کرنا ہوگا۔

میرے مقاصد بھی کچھ یہی تھے اور مقاصد کے حصول کے لئے مجھے یکسوئی درکار تھی اور میں نے بھی اپنی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک بڑے مقصد کے لئے چھوٹے مقصد کو ترک کر دیا۔ میں اس ضمن میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تاجر تھے اور تبلیغ بھی کرتے تھے... دین کی خدمت کے سبب ان کا کاروبار آہستہ آہستہ سمٹتا چلا گیا... پھر میرا واقعہ بھی خاصا توجہ طلب ہے۔ جب میں جمعیت طلباء کے لئے پنجاب اور لاہور کا ناظم تھا تو فردری میں اجلاس ہوا۔ مودودی صاحب... اور مولانا اصلاحی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میری وہ تقریر "ہم اور ہمارا کام" آج تک جمیعت میں چلتی ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ علمِ دین کے کام میں بھی آگے رہیں اور تعلیم میں بھی آگے بڑھیں... میں نے اسی رات گیارہ بجے مولانا مودودی صاحب کو پکڑ لیا۔ میں نے کہا۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں پرائمری سے اسکالرشپ لیتا آیا ہوں۔ چوتھی، آٹھویں، دسویں پھر ایف۔ ایس۔ سی میں فورتھ پوزیشن لی اور اسکالرشپ یونیورسٹی میں میں نے فورتھ پوزیشن لی۔ فرسٹ ائیر میڈیکل کالج میں فرسٹ آیا اور میرے پاس سیکنڈ ائیر میں دو اسکالرشپ تھے۔ یعنی ایف۔ ایس۔ سی کا بھی اور فرسٹ ائیر میڈیکل کا بھی... لیکن میں دونوں جگہوں پر بیک وقت کیسے بیٹھ سکتا ہوں... تو مولانا صاحب نے کہا... ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خود یہی حال ہے، جب سے تحریک عوامی دور میں داخل ہوئی ہے، میرا لکھنا، پڑھنا اور مطالعے کا کام تقریباً رُک گیا ہے اور میں اپنے سابقہ مطالعے پر بسر کر رہا ہوں۔' اس سے ثابت ہوا کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ کام' پوری تندہی سے انجام نہیں دیئے جا سکتے اور پھر..."

وہ ایک لمحے کو رُکے۔

"کسی مقصد کے حصول کے لئے لازمی بات ہے کہ پوری طاقت' حوصلوں اور علم کو ہر طرف پھیلانے کے بجائے، سمیٹ کر ایک نقطے پر مرکوز کر دینا چاہئے۔ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار نہیں ہوا جا سکتا۔ اسی وجہ سے میں نے پریکٹس چھوڑ دی۔"

"کتنے بچے ہیں، آپ کے؟"

"چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔"

"کسی نے میڈیکل کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک لڑکے نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا ہے۔ دوسرے نے ایم۔ اے فلاسفی کیا۔ دونوں ہماری قرآن اکیڈمی میں کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو ہم نے شام کا کلینک کھول دیا ہے جس کا نام انجمن کلینک رکھا گیا ہے۔"

"بیٹیوں میں سے کسی نے میڈیکل کیا ہے؟"

"نہیں، بیٹیوں کو میں نے اسکول بھیجا ہی نہیں۔ انہیں گھر ہی پر ایف۔ اے تک تعلیم دلوائی ہے۔ شریعت کی حدود کے عین مطابق علم بھی دیا اور پردہ بھی... پھر شادیاں کر دیں۔"

"عید الفطر کے لئے آپ کا پیغام؟"

"اگرچہ کہ میں ذہنی طور پر اس انٹرویو کے لئے تیار نہ تھا۔ تاہم آپ نے انٹرویو لے ہی لیا ہے تو پھر پیغام بھی لکھ لیجئے۔"

"عید درحقیقت ایک شکریہ ہے' رمضان کے روزوں کا' جو ہم ادا کرتے ہیں اور عید اصل میں اُن ہی لوگوں کے لئے ہے جو رمضان میں روزے رکھیں اور راتوں کو قرآن مجید کی تلاوت سے آباد رکھیں۔ جنہوں نے اس روحانی موسم بہار سے صحیح طور پر استفادہ کیا ہو' وہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم نے اس کو ایک فیسٹیول بنا لیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئیے کہ عید کا جو اسلامی تصوّر ہے' وہ بگڑنے نہ پائے۔ عید کی سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو واقعتہً نفس کی غلامی سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے ایک ماہ کی مشقت کرتے ہیں، اُن کا اللہ تعالیٰ کے سامنے شکرانے کی یہ دو رکعتیں ادا کرنا بھی معنی خیز عمل ہے۔ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ورنہ تو یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک تہوار کی سی صورت دے دی ہے۔"

"گزشتہ دنوں' عید پر سویّوں کے بارے میں' آپ کے بیان پر بڑی گرما گرم بحث رہی۔ کیا سویّاں کھانا شرعاً غلط ہے؟"

"شرعاً غلط تو میں نے کبھی نہیں کہا۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ بعض چیزیں روایت کے طور پر ہمارے درمیان اس قدر مستحکم ہو گئی ہیں کہ ہم اُن سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ حالانکہ ان کا کوئی ثبوت سنّت میں نہیں ہے... اور بعض چیزیں جن کی تاکید کی گئی ہے' وہ ہمارے ذہنوں سے اُتر گئی ہیں۔ مثلاً عید کی نماز کو جاتے اور آتے ہوئے تکبیر پڑھنا بھول جاتے ہیں اور واپسی کے وقت راستہ تبدیل کر کے آنے کی سنّتِ نبویؐ کا خیال نہیں کرتے... لیکن یہ کہ ہر عید پر کچھ چیزیں لازمی سی اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

جب اصل سنّت ترک کی جائے گی تو اس کی جگہ کوئی اور رسم لے لے گی۔ اس اعتبار سے تو سویّاں گویا لازم ہو گئی ہیں۔ حالانکہ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اس عید پر کوئی میٹھی شے صبح کے وقت کھاتے ہیں۔ یعنی یہ فرض ہے کہ کوئی میٹھی چیز کھا کر آدمی، عید الفطر کی نماز کے لئے جائے۔ عید الضحیٰ میں روزے کی حالت میں جاتے ہیں اور واپس آ کر قربانی کے گوشت سے روزہ کھولتے ہیں۔ یہ عید تو اب عید الفطر کے بجائے سویّوں والی عید بن کر رہ گئی ہے۔ اسی طرح سنّت میں عید پر بغلگیر ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا... لیکن یہ یوں لازم ہو گیا ہے، جیسے اس کے بغیر عید ادھوری رہ جائے گی۔"

ڈاکٹر اسرار احمد تھکان سی محسوس کر رہے تھے اور ہم بھی جو کچھ حاصل کر چکے تھے' وہ کافی تھا۔ ہم نے اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا... کیونکہ صبح آٹھ بجے، ڈاکٹر صاحب کراچی سے واپس جا رہے تھے۔

پاکستان کی
قومی بندرگاہ....
... پوری لگن کے ساتھ
قومی تجارت کے فروغ کے لیے
اپنی کوشش تیز سے تیز تر
کر رہی ہے۔
کراچی پورٹ ٹرسٹ
تجارت اور معیشت کی خدمت میں
کراچی پورٹ
پاکستان کی قومی بندرگاہ

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 33 | JANUARY 1984 | No. 1

قدرتی گیس کا ضیاع روکیئے

ہمارے توانائی کے وسائل محدود ہیں ہم توانائی کے ضیاع کے متحمل نہیں ہو سکتے

گیس بچاکر
قومی معیشت کو
مستحکم بنائیے

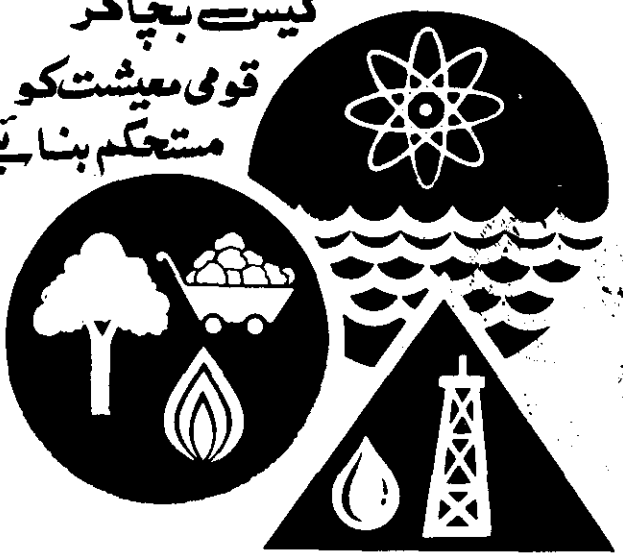

ہمارے ملک میں توانائی کے وسائل کی کمی ہے۔ توانائی کی ضروریات کثیر زر مبادلہ صرف کر کے پوری کی جاتی ہیں۔ ہماری صنعت، تجارت، زراعت کے شعبوں میں توانائی کی مانگ روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ آپ کی بچائی ہوئی توانائی ان اہم شعبوں کے فروغ میں کام آئے گی۔

قدرتی گیس بہت زیادہ قیمتی ہے۔
اسے ضائع نہ کیجئے

سوئی ناردرن گیس پائپ لائنز لمیٹڈ

SNGPL 4/80

paragon

Ahmed Afaal
192-G, BLOCK-2
P.E.C.H.S., KARACHI-29
Phone: 440803